جلد ۷۷ جون ۱۹۷۲ء عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

خالی صفحه

ترجمانُ القرآن، لاہور

فہرست مضامین

عدد ۴	جون ۱۹۷۲ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ	جلد ۷۷

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

چندہ سالانہ آٹھ روپے ــــــ فی پرچہ: ۸۰ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

ہمارے موجودہ صدرِ مملکت زبان کے استعمال کے معاملے میں تو مطلق العنان ہیں ہی، اس لیے ان کی زبان فیض ترجمان سے گفتنی اور ناگفتنی ہر طرح کی باتیں نکلتی رہتی ہیں۔ مگر مئی کے آخر میں انہوں نے مغربی جرمنی کے ایک اخبار نویس کو جو تفصیلی انٹرویو دیا ہے اس میں ایک بات ایسی کہی ہے جو دینی اور قومی نقطۂ نظر سے سخت قابلِ اعتراض ہے۔ ہم صدر صاحب کے اِس مزاج کو جاننے کے باوجود کہ وہ ترنگ میں آکر بعض اوقات بڑی عجیب و غریب باتیں کہ جاتے ہیں، جن کے بارے میں وہ قطعی طور پر سنجیدہ نہیں ہوتے، مضطرب ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے سیاسی اور معاشی عزائم کے اظہار کے لیے ایک ایسی اصطلاح استعمال کی ہے جو ہمارے نزدیک بڑی معنی خیز ہے۔ اس سے پیشتر وہ اپنے ان عزائم کو سوشلزم کے لفظ سے ظاہر کیا کرتے تھے اور کبھی اسے مشرف باسلام کر کے اسلامی سوشلزم کہہ دیتے تھے۔ لیکن اب کی مرتبہ انہوں نے یہ اصطلاح ترک کر کے مارکسزم کی اصطلاح استعمال کی ہے اور اس کے ساتھ قوم کو یہ "مژدہ" بھی سنایا ہے کہ وہ اسلام کے معتقدات اور اس کی روایات کے ساتھ مارکسزم کی پیوند کاری کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اُن کے اس عزم کو دیکھتے ہوتے انسان کے ذہن میں بالکل ناگزیر طور پر دو احساسات اُبھرتے ہیں۔ پہلا یہ کہ اُن کی نگاہ میں اسلام معاذاللہ ایک نامکمل ضابطۂ حیات ہے جو اپنی تکمیل کے لیے مارکسزم کی پیوندکاری کا محتاج ہے، کیونکہ اگر وہ اسے مکمل ضابطۂ حیات سمجھتے تو پھر انہیں اسلام کے دینی معتقدات کے ساتھ کارل مارکس کی سیاسی اور معاشی تعلیمات کو جوڑ کر دینِ حق کو مکمل کرنے کی قطعاً ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ دوسرے احساس کے اُبھرتے ہی صاحبِ صدر کی بصیرت اور اُن کی معاملہ فہمی مشتبہ ہو جاتی ہے۔

وہ دین کے عالم نہ سہی، مغربی یونیورسٹیوں کے تربیت یافتہ تو ضرور ہیں۔ ان یونیورسٹیوں میں ایک طویل مدت گزارنے کے بعد ان کے اندر اتنی بصیرت تو پیدا ہو جانی چاہیے تھی کہ وہ اس سادہ سی حقیقت کو سمجھ سکیں کہ اوّل تو دو الگ نظاموں کے مابین، جو حیاتِ انسانی کے سارے گوشوں پر محیط ہوں، کسی قسم کی پیوندکاری کوئی مفید نتائج برآمد نہیں کر سکتی لیکن خاص طور پر دو ایسے نظامہائے حیات جو اساسی تصورات سے لیکر زندگی کی عملی جزئیات تک کے معاملے میں ایک دوسرے سے نہ صرف مختلف ہوں بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہوں، کے مابین کوئی جوڑ لگا کر کسی مفید نتیجہ کی توقع کرنا سراسر خام خیالی ہے۔

کون نہیں جانتا کہ اسلام ایک ایسا مکمل اور ہمہ گیر ضابطۂ حیات ہے جو پورے کا پورا خدا پرستی کی بنیاد پر استوار کیا گیا ہے۔ اس کے معتقدات، اس کا نظامِ اخلاق، اس کا نظامِ معیشت و معاشرت اور اس کا نظامِ سیاست، الغرض زندگی کے سارے شعبے عقیدۂ خدا پرستی کا عکس پیش کرتے ہیں۔

اسلام کے مقابلے میں مارکسزم ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جو اوّل تا آخر مادیت پرستی کی اساس پر قائم ہے۔ اس میں مادہ ہی کو تخلیق کی علتِ اُولیٰ قرار دیکر فکر و عمل کے سارے ڈھانچے تیار کیے گئے ہیں۔ اس نظام کی رُو سے مادہ کے سوا اس کائنات کا کوئی خالق و مالک نہیں۔ اس وجہ سے خدا، حشر و نشر، وحی و الہام سب توہمات کا درجہ رکھتے ہیں۔ انسان کا مادی ماحول جسے مارکس ذرائع پیداوار کا نام دیتا ہے، انسانی شعور اور اخلاق کی صورت گری کرتا ہے۔ ان ذرائع کی تبدیلی سے نہ صرف معیشت میں تبدیلی ہوتی ہے بلکہ اخلاق، معاشرت، قانون، سیاست، الغرض انفرادی اور اجتماعی زندگی کا پورا ڈھانچہ اُن کے مطابق بدل جاتا ہے۔ اس نظریے کی بنا پر دنیا کا کوئی اصُول، خیر و شر کا کوئی پیمانہ بھی مستقل قدر و قیمت کا حامل نہیں بلکہ معاشی تبدیلیوں کے ساتھ یہ اصول اور پیمانے مسلسل بدلتے رہتے ہیں۔ اسی طرح حق و ناحق، خوب و ناخوب کا بھی کوئی قطعی اور حتمی معیار نہیں۔ ذرائع پیداوار انسانوں کے مابین جن معاشی روابط کی تشکیل کر دیں وہی ایک خاص وقت میں حق و انصاف کے معیارات قرار پاتے ہیں۔ اور ان ذرائع میں تغیر کی وجہ سے جو نئے روابط معرضِ وجود میں آئیں وہی دوسرے وقت حق و صداقت کے پیمانے بن جاتے ہیں۔

مارکس کے نزدیک تو خیر مذہب انسانیت کے لیے افیون ہی ہے۔ لیکن اس کے وہ پیرو جنہوں نے مذہب دشمنی میں کسی قدر اعتدال پسندی کا ثبوت دیا، اُن کے نزدیک بھی اگر کوئی مذہب کسی قدر و

قیمت کا حامل تھا تو وہ ایک خاص عہد اور ماحول میں تھا جس کے بدل جانے سے اُس کی افادیت یکسر ختم ہو گئی ہے۔ چنانچہ ان کی تحریروں میں اسلام کا ذکر بھی اسی انداز سے آیا ہے کہ حضور سرکارِ دوعالم کے عہد میں عرب سماج کے معاشی ڈھانچے میں جو تغیرات پیدا ہو رہے تھے حضورؐ نے ان کا اچھی طرح ادراک کر کے اُن کے تقاضوں کے مطابق عرب سوسائٹی کے اندر تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ اور یہی ان معتدل سوشلسٹوں کے نزدیک حضورؐ کا اصلی کارنامہ ہے۔ اُن کے اِن مذموم خیالات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کے لیے خداوند تعالیٰ کے منشا کو انسانیت پر واضح کرنے والے نہیں بلکہ اپنے دَور کی عرب سوسائٹی کے "انقلابی قائد" تھے، جنہوں نے معاشی میدان میں چند تبدیلیاں لا کر اُس زمانے کے حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔

اسلام کے بارے میں اس قسم کے خیالات پر غور کیجیے اور دیکھیے کیا کوئی شخص انہیں قبول کر کے مسلمان رہ سکتا ہے؟ جو "ازم" اس بات کا دعویدار ہو کہ ہر دَور کا اپنا الگ "قرآن" ہے اور جس کے نزدیک کسی نظریے اور عمل کی صحت کا سارا دارومدار صرف اس بات پر ہے کہ وہ پیداوار کے اندر تغیرات کے ساتھ بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہو، وہ ازم کسی ابدی پیغام یا کسی ابدی سچائی اور صداقت کا کس طرح علمبردار بن سکتا ہے؟

ہمیں اس وقت اس امر سے کوئی بحث نہیں کہ جو لوگ اس نظریہ کے حامی ہیں وہ خود اس کے کہاں تک پابند ہیں۔ ہمیں تو یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ایک مسلمان جس کا ایمان یہ ہے کہ اسلام انسانیت کے نام خدا کا پہلا اور آخری پیغام ہے اور جس میں قیامت تک کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہ آخری پیغمبر ہیں جن کے ذریعہ قادرِ مطلق نے اپنے اس پیغام کے مضمرات قیامت تک حتمی صورت میں واضح کر دیئے، اِس بنا پر حضورؐ کی نبوت اصلاحِ معیشت کی کوئی عارضی اور وقتی تحریک نہیں بلکہ ہمہ گیر ہدایتِ الٰہی کا واحد سرچشمہ ہے، وہ اشتراکی خرافات پر کس طرح ایمان لا سکتا ہے؟ جو لوگ اس قسم کے باہم متصادم معتقدات کو ایک دوسرے کے ساتھ پیوست کر کے ایک مخلوطہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں وہ یا تو اناڑی ہیں یا پھر مرفوع القلم۔

اسلام کے خلاف ماضی میں بھی اعتراضات ہوتے رہے ہیں مگر اُن کی نوعیت زیادہ تر کلامی مسائل کی سی تھی۔ لیکن دَورِ حاضر میں جس قدر اعتراضات ہو رہے ہیں اور اسلامی تعلیمات کے بارے میں ذہنوں میں جو شکوک و شبہات پیدا کیے جا رہے ہیں وہ بیشتر تاریخ کی مادی تعبیر کی پیداوار ہیں۔ ان اعتراضات کی ساری عمارت اس غلط مفروضے پر اٹھائی گئی ہے کہ معاشی ماحول کے بدل جانے سے حق و صداقت کے معیارات بدل جاتے ہیں۔ چنانچہ اسلام پر اعتراضات کا اگر دقّتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو آپ اُن کی تہ میں یہی غلط مفروضہ کارفرما پائیں گے۔ ہم یہاں چند اعتراضات بطورِ مثال نقل کرتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات کو وقتی اور عارضی اور دَورِ حاضر کے لیے بیکار ثابت کرنے کی غرض سے یہ کہا جاتا ہے کہ آخر یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ کسی قدیم معاشرے کے اصولوں کو دَورِ جدید کی ترقی یافتہ اور مہذب سوسائٹی پر ٹھونسنے کی کوشش کی جائے؟ اپنے اس اعتراض کے اندر وزن پیدا کرنے کے لیے یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ وہ لباس جو ایک چھوٹے بچے کے لیے تراشا جاتا ہے وہ ایک جوان آدمی کے جسم پر کس طرح راست آسکتا ہے اور اگر کوئی شخص ایسی کوشش کرے تو اس کے فاترالعقل ہونے پر کسے شبہ ہو سکتا ہے؟ دوسرے سارے اعتراضات درحقیقت اسی اعتراض کی مختلف فروعات ہیں۔ مثلاً اسلامی نظام ۳۰ سال تک کامیابی کے ساتھ چلا اور پھر انتشار کی نذر ہو گیا۔ اس اعتراض میں جو کچھ باور کرانا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ۳۰ سال کے عرصے میں عرب کے اندر جو معاشی تبدیلیاں آئیں انھوں نے اس نظام کی افادیت کو ختم کر دیا اور معاشی تغیرات کی وجہ سے ایسے نئے تقاضے اُبھرے جو کسی نئے دین کے طالب تھے۔ اس کے علاوہ اسلام کو یہ بھی طعنہ دیا جاتا ہے کہ یہ بادشاہوں کی پُشت پناہی کرتا ہے اور جاگیرداری اور سرمایہ داری کے لیے ڈھال کا کام دیتا ہے۔

اس طعنہ زنی کا مقصد یہ ہے کہ نوجوان نسل کے ذہن میں یہ باطل خیال بٹھا دیا جائے کہ اسلام ایک ایسا رجعت پسندانہ نظام ہے جسے دنیا کے ظالموں نے استحصال اور ناانصافی کے لیے بطورِ آلۂ کار استعمال کیا اور اب تک کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس دین کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی رہنمائی کے لیے نازل نہیں فرمایا بلکہ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے استحصال اور اپنے ناجائز مفادات کے تحفظ کے لیے گھڑا ہے اور وہی آج تک اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس طنز میں ایک طرف تو اس دین کے بارے میں بوسیدہ اور ازکار رفتہ ہونے کا تاثر قائم ہوتا ہے اور دوسری طرف یہ باطل

نقش بھی دل و دماغ پر ثبت ہوتا ہے کہ یہ دین آزادی، روشن خیالی، عدل و انصاف کا دشمن اور ظلم و استبداد کا مؤید اور حامی ہے؟

تاریخ کی مادی تعبیر جس کی اصل سے اعتراضات کی یہ ساری فروعات پھوٹتی ہیں، انسانیت اور انسانی ارتقاء کے نہایت گمراہ کن مطالعہ پر مبنی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ معاشی حالات میں تغیر و تبدل سے معاشرتی زندگی بھی بعض اثرات قبول کرتی ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لینا کہ ذرائع پیداوار ہی کسی معاشرے کے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی تصورات کی صورت گری کرتے ہیں بہت بڑی جہالت ہے۔ اگر مارکس کے اس دعوے کو صحیح مان لیا جاتے تو پھر ان تمام معاشروں میں فکر و عمل کی پوری ہم آہنگی پائی جانی چاہیے جن میں ذرائع پیداوار ایک قسم کے ہیں یا جو معاشی اعتبار سے ارتقاء کی ایک خاص سطح پر ہیں۔ لیکن تاریخ کے اوراق نہ صرف یہ کہ اس دعوے کی تصدیق نہیں کرتے بلکہ اس کی پرزور تردید کرتے ہیں۔ اہلِ روم اور قرنِ اول کے مسلمان معیشت کے ایک ہی دور میں تھے مگر ان کے افکار و نظریات، ان کے اخلاقی معیارات، ان کے خوب و ناخوب کے پیمانوں اور ان کے معاشرتی اور سیاسی ڈھانچوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ان کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جس میں کسی قسم کی مماثلت پائی جاتی ہو۔ دونوں ہر لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد تھے۔ اس تضاد کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ قوموں اور افراد کی تعمیر میں فیصلہ کن قوت معاشی نہیں بلکہ وہ مقاصد ہیں جن کے حصول کے لیے وہ جد و جہد کرتے ہیں۔ مقاصد کا اختلاف ان کے طرزِ عمل اور طرزِ فکر میں اختلاف پیدا کر دیتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ زندگی کے خارجی مظاہر خصوصاً اس کے معاشی حالات کسی قوم کے فکر و عمل کا ہیولیٰ تیار نہیں کرتے بلکہ اس کے عزائم اور مقاصد اس کی زندگی کی تشکیل کرتے ہیں۔

پھر اسلامی نظام کو لباس پر قیاس کر کے یہ فیصلہ صادر کر دینا کہ چونکہ بچپن کا لباس جوانی میں بیکار ہوتا ہے۔ اس لیے ہر وہ نظامِ حیات جس کا ماضی سے تعلق ہے وہ حال کے لیے بے سود ہے بلکہ ضرر رساں ہے، قیاس مع الفارق ہے۔ اسلامی نظامِ حیات اور لباس میں کوئی چیز بھی مشترک نہیں، بلکہ اسے اگر انسانی زندگی کے کسی حصے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے تو روح ہے جس طرح روح انسان

کے ساتھ برابر جاری وساری رہتی ہے اور وہ کسی مرحلے پر بھی فرسودہ اور بیکار نہیں ہوتی۔ اسی طرح اللہ کا دین بھی ہر عہد اور ہر دَور میں انسان کی پوری طرح رہنمائی کرتا ہے۔ وہ کبھی بوسیدہ نہیں ہونے پاتا۔ اس بات کی ضرورت البتہ ہر منزل پر رہتی ہے کہ رُوح کی طرح اللہ کے دین کو بھی ہر قسم کی آلودگی سے پاک رکھا جائے، تاکہ وہ پُوری قوت کے ساتھ انسانی جسم کی توانائیوں کو کسی اچھے کام میں لگا سکے۔

اسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو جتنا تاریخی تسلسل اللہ کے دین میں پایا جاتا ہے کسی دوسرے نظریۂ حیات میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ جو لوگ مذہب یا کسی نظامِ حیات کو لباس پر قیاس کر کے انسانی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں ان کے نزدیک ماضی کی ہر چیز واقعی عبث اور بیکار ہے لیکن جو لوگ ہدایتِ الٰہی کو انسانیت کے لیے بمنزلہ رُوح سمجھ کر اس کے ارتقاء کا جائزہ لیتے ہیں، وہ پُوری تاریخ کو حق و باطل کی ایک نہ ختم ہونے والی کشمکش پاتے ہیں جس میں انسان ماضی سے سبق اور عبرت حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ ماضی ہی میں اللہ تعالیٰ نے اُن بزرگ و برتر ہستیوں کو دنیا میں مبعوث فرمایا جنہوں نے اس کشمکش میں مثالی کردار ادا کر کے انسانیت کو یہ بتایا کہ حق کی کس طرح حمایت کرنی چاہیے اور باطل کے خلاف کس عزم، ہمت اور تدبّر سے صف آرا ہونا چاہیے۔

تاریخ کی مادّی تعبیر پر ایمان رکھنے والوں کے لیے تو ممکن ہے کہ انہیں ماضی میں سوائے جہالت اور استحصال کے اور کچھ نظر نہ آتا ہو لیکن وہ قوم ماضی کو کس طرح نظر انداز کر سکتی ہے جسے ان گزرے ہوئے اَدوار میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات میں انسانیت کا سب سے ارفع اور اعلیٰ نمونہ ملا ہو اور جس کی پیروی کر کے ہی اس نے زندگی کے ہر گوشے میں غیر معمولی طور پر نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہوں۔ اس قوم سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ ماضی کی طرف دیکھنا چھوڑ دے بہت بڑی حماقت ہے۔ تاریخ درحقیقت انسانی حافظے کا دوسرا نام ہے۔ اُس شخص کے لیے تو بلاشبہ یادِ ماضی عذاب ہے جو اپنے حافظے میں سوائے گھناؤنے جرائم کے اور کوئی چیز محفوظ نہیں پاتا لیکن وہ شخص اپنے ماضی کو کس طرح بھلا دینے پر آمادہ ہو سکتا ہے جس کے حافظے میں پاکبازی، شرافت، دیانت، عدل و انصاف اور خدمتِ انسانیت کی لاتعداد قندیلیں فروزاں

ہوں۔ ان قندیلوں کی روشنی سے تو وہی شخص خوف زدہ ہو کر انہیں شعور کی نظروں سے اوجھل رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کی فطرت مسخ ہو جانے کی وجہ سے پاکبازی کے مقابلے میں ہوسناکی سے، شرافت کے مقابلے میں رذالت سے، عدل و انصاف کے مقابلے میں ظلم و استبداد سے اور خدمتِ انسانیت کے مقابلے میں عیاری چالاکی اور زبردست آزاری سے ایک گہرا لگاؤ پیدا ہو چکا ہو۔ اسلام نے مسلمانوں کے شعور میں تاریخی تسلسل کے جو گہرے اثرات مترتب کیے ہیں ان کے نقوش اسلامی تہذیب اور معاشرت کے ہر گوشے میں نہایت واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہم یہاں صرف قانون سازی کے دائرے میں ان اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے ہاں آزادی اور اصلاحِ احوال کی بے شمار تحریکات نے مختلف ادوار میں جنم لیا، لیکن کبھی بھی ان کے ہاں یہ سوال زیر بحث نہیں آیا کہ آزادی کے بعد یا اصلاحِ احوال کی کسی تحریک کے کامیاب ہو جانے کے بعد وہ کن مقاصد کی تکمیل کریں گے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اُن کے مقاصد روزِ اوّل سے متعین ہیں اور مسلم سوسائٹی کے ہر فرد کے قلب و دماغ کی لوح پر یہ مقاصد اسی وقت ثبت ہو جاتے ہیں جب وہ دنیا میں آنکھ کھولتے ہی اذان کی آواز سنتا ہے۔

باقی ممالک کو توفی الحال جانے دیجیے، صرف اِس برِ عظیم کی تاریخ پر نگاہ ڈال کر دیکھیے کہ مسلمانوں میں اصلاحِ احوال کے لیے کتنی تحریکیں اُبھریں۔ ان تحریکوں کے طریقہ ہائے کار میں بھی نمایاں اختلافات رہے۔ لیکن ان کے مقاصد میں کبھی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ ان سب کے پیشِ نظر ایک ہی مقصد تھا کہ مسلمانوں کی زندگی ہر لحاظ سے اُس نقشے کے مطابق مرتب ہونی چاہیے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ خود تحریک پاکستان اسی ایک مقصد کی تکمیل کے لیے شروع ہوئی اور پروان چڑھی۔ اور قیامِ پاکستان کے بعد پوری قوم نے قراردادِ مقاصد کی صورت میں اس حقیقت کو آئینی طور پر تسلیم کیا کہ مسلمانوں کے الگ خطۂ ارضی کے مطالبہ کا مقصد صرف ایک ہی تھا کہ وہ اس ملک میں اسلامی نظام کو برگ و بار لاتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ پچھلے دنوں عدالتِ عظمیٰ نے جو معرکۃ الآرا فیصلہ صادر کیا ہے اس میں بھی فاضل ججوں نے اس بات کی واضح نشاندہی کی ہے کہ قراردادِ مقاصد اس ملک کی اصل سمت ہے جس طرف اُسے بڑھنا چاہیے۔ اس بنا پر آج جو کوئی بھی اسلامی نظام کے نصب العین سے انحراف کرتا ہے۔ وہ درحقیقت اس ملک اور اس قوم کا سب سے بڑا بدخواہ ہے۔

(باقی ص۴۶ پر)

تفہیم القرآن

العَادِیات

نام پہلے ہی لفظ اَلْعٰدِیٰت کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول اس کے مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، جابر، حسن بصری، عکرِمہ اور عطاء کہتے ہیں کہ یہ مکی ہے۔ حضرت اَنَس بن مالک اور قَتادہ کہتے ہیں کہ مدنی ہے۔ اور حضرت ابن عباس سے دو قول منقول ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ سُورۃ مکی ہے اور دوسرا یہ کہ مدنی ہے لیکن سُورۃ کا مضمون اور اندازِ بیان صاف بتا رہا ہے کہ یہ نہ صرف مکی ہے بلکہ مکہ کے بھی ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے۔

موضوع اور مضمون اِس کا مقصود لوگوں کو یہ سمجھانا ہے کہ انسان آخرت کا منکر یا اُس سے غافل ہو کر کیسی اخلاقی پستی میں گر جاتا ہے، اور ساتھ ساتھ لوگوں کو اِس بات سے خبردار بھی کرنا ہے کہ آخرت میں صرف اُن کے ظاہری افعال ہی کی نہیں بلکہ ان کے دلوں میں چھپے ہوئے اَسرار تک کی جانچ پڑتال ہو گی۔

اِس مقصد کے لیے عرب میں پھیلی ہوئی اُس عام بد امنی کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس سے سارا ملک تنگ آیا ہوا تھا۔ ہر طرف کشت و خون برپا تھا۔ لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ قبیلوں پر قبیلے چھاپے مار رہے تھے اور کوئی شخص بھی رات چین سے نہیں گزار سکتا تھا، کیونکہ ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کب کوئی دشمن صبح سویرے اُس کی بستی پر ٹوٹ پڑے۔ یہ ایک ایسی حالت تھی جسے عرب کے سارے ہی لوگ جانتے تھے اور اس کی قباحت کو محسوس کرتے تھے۔ اگرچہ لُٹنے والا اس پر ماتم کرتا تھا اور لُوٹنے والا اس پر خوش ہوتا تھا، لیکن جب

کسی وقت لوٹنے والے کی اپنی شامت آجاتی تھی تو وہ بھی یہ محسوس کر لیتا تھا کہ یہ کیسی بُری حالت ہے جس میں ہم لوگ مبتلا ہیں۔ اس صورتِ حال کی طرف اشارہ کرکے یہ بتایا گیا ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی اور اُس میں خدا کے حضور جواب دہی سے ناواقف ہو کر انسان اپنے رب کا ناشکرا ہو گیا ہے، وہ خدا کی دی ہوئی قوتوں کو ظلم و ستم اور غارت گری کے لیے استعمال کر رہا ہے، وہ مال و دولت کی محبت میں اندھا ہو کر ہر طریقے سے اُسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے خواہ وہ کیسا ہی ناپاک اور گھناؤنا طریقہ ہو، اور اُس کی حالت خود اِس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ وہ اپنے رب کی عطا کی ہوئی قوتوں کا غلط استعمال کرکے اس کی ناشکری کر رہا ہے۔ اُس کی یہ روش ہرگز نہ ہوتی اگر وہ اُس وقت کو جانتا ہوتا جب قبروں سے زندہ ہو کر اٹھنا ہوگا، اور جب وہ ارادے اور وہ اغراض و مقاصد تک دلوں سے نکال کر سامنے رکھ دیے جائیں گے جن کی تحریک سے اُس نے دنیا میں طرح طرح کے کام کیے تھے۔ اُس وقت انسانوں کے رب کو خوب معلوم ہوگا کہ کون کیا کرکے آیا ہے اور کس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جانا چاہیے۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

قسم ہے اُن (گھوڑوں) کی جو پُھنکارے مارتے ہوئے دوڑتے ہیں[۱]، پھر (اپنی ٹاپوں سے) چنگاریاں جھاڑتے ہیں[۲]، پھر صبح سویرے چھاپہ مارتے ہیں[۳]، پھر اُس موقع پر گرد و غبار اڑاتے ہیں، پھر اِسی حالت میں کسی مجمع کے اندر جا گھستے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے[۴]،

---

[۱] آیت کے الفاظ میں یہ تصریح نہیں ہے کہ دوڑنے والوں سے مراد گھوڑے ہیں، بلکہ صرف وَالْعٰدِیٰت (قسم ہے دوڑنے والوں کی) فرمایا گیا ہے۔ اِسی لیے مفسرین کے درمیان اس باب میں اختلاف ہوا ہے کہ دوڑنے والوں سے مراد کیا ہے۔ صحابہ و تابعین کا ایک گروہ اِس طرف گیا ہے کہ اس سے مراد گھوڑے ہیں، اور ایک دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ اس سے مراد اونٹ ہیں۔ لیکن چونکہ دوڑتے ہوئے وہ خاص قسم کی آواز جسے ضَبْح کہتے ہیں، گھوڑوں ہی کی شدّتِ تنفّس سے نکلتی ہے، اور بعد کی آیات بھی جن میں چنگاریاں جھاڑنے اور صبح سویرے کسی بستی پر چھاپہ مارنے اور وہاں گرد اڑانے کا ذکر آیا ہے، گھوڑوں ہی پر راست آتی ہیں، اس لیے اکثر محققین نے اس سے مراد گھوڑے ہی لیے ہیں۔ ابن جریر کہتے ہیں کہ "دونوں اقوال میں سے یہ قول ہی قابلِ ترجیح ہے کہ دوڑنے والوں سے مراد گھوڑے ہیں، کیونکہ اونٹ ضَبْح نہیں کرتا، گھوڑا ہی ضَبْح کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اُن دوڑنے والوں کی قسم جو دوڑتے ہوئے ضَبْح کرتے ہیں۔" امام رازی کہتے ہیں کہ "اِن آیات کے الفاظ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ مراد گھوڑے ہیں، کیونکہ ضَبْح کی آواز گھوڑے کے سوا کسی سے نہیں نکلتی، اور آگ جھاڑنے کا فعل بھی پتھروں پر سُموں کی ٹاپ پڑنے کے سوا کسی اور طرح کے دوڑنے سے نہیں ہوتا، اور اسی طرح صبح سویرے چھاپہ مارنا بھی دوسرے جانوروں کی بہ نسبت گھوڑوں ہی کے ذریعے سے سہل ہوتا ہے۔"

[۲] چنگاریاں جھاڑنے کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ گھوڑے رات کے وقت دوڑتے ہیں، کیونکہ رات ہی کو اُن کی ٹاپوں سے جھڑنے والے شرارے نظر آتے ہیں۔

[۳] اہلِ عرب کا قاعدہ تھا کہ جب کسی بستی پر انہیں چھاپہ مارنا ہوتا تو رات کے اندھیرے میں چل کر جاتے تاکہ دشمن خبردار نہ ہو سکے، اور صبح سویرے اچانک اُس پر ٹوٹ پڑتے تھے تاکہ صبح کی روشنی میں ہر چیز نظر آسکے۔ اور دن اِتنا زیادہ روشن بھی نہ ہو کہ دشمن دُور سے ان کو آتا دیکھ لے اور مقابلہ کے لیے تیار ہو جائے۔

[۴] یہ ہے وہ بات جس پر اُن گھوڑوں کی قسم کھائی گئی ہے جو رات کو پُھنکارے مارتے اور چنگاریاں جھاڑتے ہوئے دوڑتے ہیں، پھر صبح سویرے غبار اڑاتے ہوئے کسی بستی پر جا پڑتے ہیں اور مدافعت کرنے والوں کی

اور وہ خود اس پر گواہ ہے[۵]، اور وہ مال و دولت کی محبت میں بُری طرح مبتلا ہے[۶]۔ تو کیا وہ اُس

جماعت میں گھس جاتے ہیں۔ تعجب اِس پر ہوتا ہے کہ اکثر مفسرین نے ان گھوڑوں سے مراد غازیوں کے گھوڑے لیے ہیں اور جس مجمع میں ان کے جا گھسنے کا ذکر کیا گیا ہے اُس سے مراد اُن کے نزدیک کفار کا مجمع ہے۔ حالانکہ یہ قسم اِس بات پر کھائی گئی ہے کہ "انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے"۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ میں غازیوں کے گھوڑوں کی دوڑ دھوپ اور کفار کے کسی مجمع پر اُن کا ٹوٹ پڑنا اِس امر پر کوئی دلالت نہیں کرتا کہ انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے، اور نہ بعد کے یہ فقرے کہ انسان اپنی اِس ناشکری پر خود گواہ ہے اور وہ مال و دولت کی محبت میں بُری طرح مبتلا ہے، اُن لوگوں پر چسپاں ہوتے ہیں جو خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے نکلتے ہیں اِس لیے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس سُورہ کی ابتدائی پانچ آیات میں جو قسمیں کھائی گئی ہیں اُن کا اشارہ دراصل اُس عام کشت و خون اور غارت گری کی طرف ہے جو عرب میں اُس وقت برپا تھی۔ جاہلیت کے زمانے میں رات ایک بہت خوفناک چیز ہوتی تھی جس میں ہر قبیلے اور بستی کے لوگ یہ خطرہ محسوس کرتے تھے کہ نہ معلوم کونسا دشمن اُن پر چڑھائی کرنے کے لیے آرہا ہو، اور دن کی روشنی نمودار ہونے پر وہ اطمینان کا سانس لیتے تھے کہ رات خیریت سے گزر گئی۔ وہاں قبیلوں کے درمیان محض انتقامی لڑائیاں ہی نہیں ہوتی تھیں، بلکہ مختلف قبیلے ایک دوسرے پر اِس غرض کے لیے بھی چھاپے مارتے رہتے تھے کہ ان کی دولت لوٹ لیں، ان کے مال مویشی ہانک لے جائیں، اور ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیں۔ اِس ظلم و ستم اور غارت گری کو، جو زیادہ تر گھوڑوں پر سوار ہو کر ہی کی جاتی تھی، اللہ تعالیٰ اِس امر کی دلیل کے طور پر پیش کر رہا ہے کہ انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔ یعنی جس طاقت کو وہ جنگ و جدل اور غارت گری میں استعمال کر رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ نے اُسے اِس لیے تو نہیں دی تھی کہ اُس سے یہ کام لیا جائے۔ پس درحقیقت یہ بہت بڑی ناشکری ہے کہ اللہ کے دیئے ہوئے اِن وسائل اور اُس کی بخشی ہوئی اِن طاقتوں کو اُس فساد فی الارض میں استعمال کیا جائے جو اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔

[۵] یعنی اُس کا ضمیر اِس پر گواہ ہے، اُس کے اعمال اِس پر گواہ ہیں، اور بہت سے کافر انسان خود اپنی زبان سے عَلانیہ ناشکری کا اظہار کرتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک خدا ہی سرے سے موجود نہیں کجا کہ وہ اپنے اوپر اُس کی کسی نعمت کا اعتراف کریں اور اس کا شکر اپنے ذمے لازم سمجھیں۔

[۶] اصل الفاظ ہیں وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ۔ اس فقرے کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ "وہ خیر کی محبت میں

وقت کو نہیں جانتا جب قبروں میں جو کچھ (مدفون) ہے اُسے نکال لیا جائے گا،؎ اور سینوں میں جو کچھ (مخفی) ہے اُسے برآمد کر کے اُس کی جانچ پڑتال کی جائے گی؟؎ یقیناً اُن کا رب اُس روز اُن سے

بہت سخت ہے"۔ لیکن عربی زبان میں خیر کا لفظ نیکی اور بھلائی کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ مال و دولت کیلیے بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ سورۂ بقرہ آیت ۱۸۰ میں خیر بمعنی مال و دولت ہی استعمال ہوا ہے۔ یہ بات کلام کے موقع و محل سے معلوم ہوتی ہے کہ کہاں خیر کا لفظ نیکی کے معنی میں ہے اور کہاں مال و دولت کے معنی میں۔ اِس آیت کے سیاق و سباق سے خود ہی یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ اِس میں خیر مال و دولت کے معنی میں ہے نہ کہ بھلائی اور نیکی کے معنی میں، کیونکہ جو انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے اور اپنے طرزِ عمل سے خود اپنی ناشکری پر شہادت دے رہا ہے، اُس کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ نیکی اور بھلائی کی محبت میں بہت سخت ہے۔

؎ یعنی مرے ہوئے انسان جہاں جس حالت میں بھی پڑے ہونگے وہاں سے اُن کو نکال کر زندہ انسانوں کی شکل میں اٹھایا جائے گا۔

؎ یعنی دلوں میں جو ارادے اور نیتیں، جو اغراض و مقاصد، جو خیالات و افکار، اور ظاہری افعال کے پیچھے جو باطنی محرکات (MOTIVES) چھپے ہوئے ہیں وہ سب کھول کر رکھ دیئے جائیں گے اور ان کی جانچ پڑتال کر کے اچھائی کو الگ اور بُرائی کو الگ چھانٹ دیا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر فیصلہ صرف ظاہر ہی کو دیکھ کر نہیں کیا جائیگا کہ انسان نے عملاً کیا کچھ کیا، بلکہ دلوں میں چھپے ہوئے رازوں کو بھی نکال کر یہ دیکھا جائے گا کہ جو جو کام انسان نے کیے وہ کس نیت سے اور کس غرض سے کیے۔ اِس بات پر اگر انسان غور کرے تو وہ یہ تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اصلی اور مکمل انصاف خدا کی عدالت کے سوا اور کہیں نہیں ہو سکتا۔ دنیا کے لادینی قوانین بھی اصولی حیثیت سے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ کسی شخص کے محض ظاہری فعل کی بنا پر اُسے سزا نہ دی جائے بلکہ یہ بھی دیکھا جائے کہ اُس نے کس نیت سے وہ فعل کیا ہے۔ لیکن دنیا کی کسی عدالت کے پاس بھی وہ ذرائع نہیں ہیں جن سے وہ نیت کی ٹھیک ٹھیک تحقیق کر سکے۔ یہ صرف اور صرف خدا ہی کر سکتا ہے کہ انسان کے ہر ظاہری فعل کے پیچھے جو باطنی محرکات کارفرما رہے ہیں ان کی بھی جانچ پڑتال کرے اور اس کے بعد یہ فیصلہ کرے کہ وہ کس جزا یا سزا کا مستحق ہے۔ پھر آیت کے الفاظ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ فیصلہ محض اللہ کے اُس علم کی بنا پر نہیں ہوگا جو وہ دلوں کے ارادوں اور نیتوں کے بارے میں پہلے ہی سے رکھتا ہے، بلکہ قیامت کے روز اِن رازوں کو کھول کر علانیہ سامنے رکھ دیا جائے گا اور کھلی عدالت میں جانچ پڑتال کر کے یہ دکھا دیا جائے گا کہ ان میں خیر کیا تھی اور شر کیا تھا۔

خوب باخبر ہوگا۹؎ ع

اسی لیے حُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ تحصیل کے معنی کسی چیز کو نکال کر باہر لانے کے بھی ہیں، مثلاً چھلکا اتار کر مغز نکالنا، اور مختلف قسم کی چیزوں کو چھانٹ کر ایک دوسرے سے الگ کرنے کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ لہٰذا دلوں میں چھپے ہوئے اسرار کی تحصیل میں یہ دونوں باتیں شامل ہیں۔ اُن کو کھول کر ظاہر کر دینا بھی، اور ان کو چھانٹ کر بُرائی اور بھلائی کو الگ کر دینا بھی۔ یہی مضمون سورۂ طارق میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے کہ یَوْمَ تُبْلَی السَّرَآئِرُ "جس روز پوشیدہ اسرار کی جانچ پڑتال ہوگی" (آیت ۹)۔

۹؎ یعنی اُس کو خوب معلوم ہوگا کہ کون کیا ہے اور کس سزا یا جزا کا مستحق ہے۔

اعلان

تفہیم القرآن کے اجزاء، البقرہ، المائدہ، یوسف، النور، الاحزاب کے بعد اسلامیات کے طالب علموں کی سہولت کی خاطر

تفسیر سورۃ الحجرات، سورۃ لقمان

بھی علیحدہ کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں

اب سورۃ الحجرات کا تیسرا اور سورۃ لقمان کا دوسرا ایڈیشن انشاء اللہ جون کے پہلے عشرے میں شائع ہو جائیگا۔

الحجرات	سائز ۱۸×۲۲/۸	صفحات ۵۶	آفسٹ سفید کاغذ۔ قیمت نیا ایڈیشن	۸۰-۱ روپیہ
لقمان	" "	۶۰	" " "	۵۰-۱ "

ضرورت مند حضرات سے گذارش ہے کہ اپنے آرڈر سے جلد مطلع فرمائیں۔

ادارہ ترجمان القرآن

اچھرہ - لاہور

تفہیم القرآن

القارعہ

نام پہلے لفظ القارعہ کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔ یہ صرف نام ہی نہیں ہے بلکہ اس کے مضمون کا عنوان بھی ہے، کیونکہ اس میں سارا ذکر قیامت ہی کا ہے۔

زمانۂ نزول اس کے مکی ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ اس کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بھی مکہ معظمہ کے ابتدائی دور کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔

موضوع اور مضمون اس کا موضوع ہے قیامت اور آخرت۔ سب سے پہلے لوگوں کو یہ کہہ کر چونکایا گیا ہے کہ عظیم حادثہ! کیا ہے وہ عظیم حادثہ؟ تم کیا جانو کہ وہ عظیم حادثہ کیا ہے؟ اس طرح سامعین کو کسی ہولناک واقعہ کے پیش آنے کی خبر سننے کے لیے تیار کرنے کے بعد دو فقروں میں ان کے سامنے قیامت کا نقشہ پیش کر دیا گیا ہے کہ اُس روز لوگ گھبراہٹ کے عالم میں اِس طرح ہر طرف بھاگے بھاگے پھریں گے جیسے روشنی پر آنے والے پروانے بکھرے ہوتے ہیں، اور پہاڑوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے، ان کی بندش ختم ہو جائے گی اور وہ دھنکے ہوئے اُون کی طرح ہو کر رہ جائیں گے۔ پھر بتایا گیا ہے کہ آخرت میں جب لوگوں کا حساب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی عدالت قائم ہوگی تو اُس میں فیصلہ اِس بنیاد پر ہوگا کہ کس شخص کے نیک اعمال بُرے اعمال سے زیادہ وزنی ہیں، اور کس کے نیک اعمال کا وزن اس کے بُرے اعمال کی بہ نسبت ہلکا ہے۔ پہلی قسم کے لوگوں کو وہ عیش نصیب ہوگا جس سے وہ خوش ہو جائیں گے، اور دوسری قسم کے لوگوں کو اُس گہری کھائی میں پھینک دیا جائے گا جو آگ سے بھری ہوئی ہوگی۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

عظیم حادثہ[۱]! کیا ہے وہ عظیم حادثہ؟ تم کیا جانو کہ وہ عظیم حادثہ کیا ہے؟ وہ دن جب لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اُون کی طرح ہونگے[۲]۔ پھر جس کے پلڑے بھاری ہونگے وہ دل پسند عیش میں ہوگا، اور جس کے پلڑے ہلکے ہونگے[۳][۴] اس کی جائے قرار گہری کھائی

---

[۱] اصل میں لفظ قارِعہ استعمال ہوا ہے جس کا لفظی ترجمہ ہے "ٹھوکنے والی"۔ قرع کے معنی کسی چیز کو کسی چیز پر زور سے مارنے کے ہیں جس سے سخت آواز نکلے۔ اسی لغوی معنی کی مناسبت سے قارعہ کا لفظ ہولناک حادثے اور بڑی بھاری آفت کے لیے بولا جاتا ہے۔ مثلاً عرب کہتے ہیں قَرَعَتْهُمُ الْقَارِعَةُ، یعنی فلاں قبیلے یا قوم کے لوگوں پر سخت آفت آگئی ہے۔ قرآن مجید میں بھی ایک جگہ یہ لفظ کسی بڑی مصیبت نازل ہونے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ سورۂ رعد میں ہے وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا تُصِيبُهُم بِمَا صَنَعُوا قَارِعَةٌ "جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان پر ان کے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی آفت نازل ہوتی رہتی ہے" (آیت ۳۱)۔ لیکن یہاں القارعہ کا لفظ قیامت کے لیے استعمال کیا گیا ہے، اور سورۃ الحاقہ میں بھی قیامت کو اسی نام سے موسوم کیا گیا ہے (آیت ۴)۔ اس مقام پر یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ یہاں قیامت کے پہلے مرحلے سے لیکر عذاب و ثواب کے آخری مرحلے تک پورے عالمِ آخرت کا یکجا ذکر ہو رہا ہے۔

[۲] یہاں تک قیامت کے پہلے مرحلے کا ذکر ہے یعنی جب وہ حادثۂ عظیم برپا ہوگا جس کے نتیجے میں دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا اُس وقت لوگ گھبراہٹ کی حالت میں اس طرح بھاگے بھاگے پھریں گے جیسے روشنی پر آنے والے پروانے ہر طرف پراگندہ و منتشر ہوتے ہیں، اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اُون کی طرح اڑنے لگیں گے۔ رنگ برنگ کے اُون سے پہاڑوں کو تشبیہ اس لیے دی گئی ہے کہ اُن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔

[۳] یہاں سے قیامت کے دوسرے مرحلے کا ذکر شروع ہوتا ہے جب دوبارہ زندہ ہوکر لوگ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہونگے۔

[۴] اصل میں لفظ مَوَازِین استعمال ہوا ہے جو موزون کی جمع بھی ہو سکتا ہے اور میزان کی جمع بھی۔ اگر اس کو موزون کی جمع قرار دیا جائے تو مَوَازِین سے مراد وہ اعمال ہونگے جن کا اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کوئی وزن ہو

جو اس کے ہاں کسی قدر کے مستحق ہوں۔ اور اگر اسے میزان کی جمع قرار دیا جائے تو موازین سے مُراد ترازو کے پلڑے ہوں گے پہلی صورت میں موازین کے بھاری اور ہلکے ہونے کا مطلب نیک اعمال کا بُرے اعمال کے مقابلے میں بھاری یا ہلکا ہونا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں صرف نیکیاں ہی وزنی اور قابلِ قدر ہیں۔ دوسری صورت میں موازین کے بھاری ہونے کا مطلب اللہ جلّ شانہٗ کی میزانِ عدل میں نیکیوں کے پلڑے کا بُرائیوں کے پلڑے کی بہ نسبت زیادہ بھاری ہونا ہے، اور اُن کے ہلکا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بھلائیوں کا پلڑا برائیوں کے پلڑے کی بہ نسبت ہلکا ہو۔ اس کے علاوہ عربی زبان کے محاورے میں میزان کا لفظ وزن کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اور اس معنی کے لحاظ سے وزن کے بھاری اور ہلکا ہونے سے مُراد بھلائیوں کا وزن بھاری یا ہلکا ہونا ہے۔ بہر حال موازین کو خواہ موزون کے معنی میں لیا جائے، یا میزان کے معنی میں، یا وزن کے معنی میں، مدعا ایک ہی رہتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں فیصلہ اس بنیاد پر ہوگا کہ آدمی اعمال کی جو پونجی لے کر آیا ہے وہ وزنی ہے یا بے وزن، یا اس کی بھلائیوں کا وزن اُس کی بُرائیوں کے وزن سے زیادہ ہے یا کم۔ یہ مضمون قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیا ہے جن کو نگاہ میں رکھا جائے تو اس کا مطلب پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے "اور وزن اُس روز حق ہوگا، پھر جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پائیں گے، اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہی اپنے آپ کو خسارے میں مبتلا کرنے والے ہوں گے" (آیات ۸-۹)۔ سورۂ کہف میں ارشاد ہوا "اے نبی اِن لوگوں سے کہو، کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد لوگ کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی و جہد راہِ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا۔ اس لیے ان کے سارے اعمال ضائع ہو گئے، قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے" (آیات ۱۰۴-۱۰۵)۔ سورۂ انبیاء میں فرمایا "قیامت کے روز ہم ٹھیک ٹھیک تولنے والے ترازو رکھ دیں گے، پھر کسی شخص پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ جس کا رائی کے دانے برابر بھی کچھ کیا دھرا ہوگا وہ ہم لے آئیں گے اور حساب لگانے کے لیے ہم کافی ہیں" (آیت ۴۷)۔ اِن آیات سے معلوم ہوا کہ کفر اور حق سے انکار بجائے خود اتنی بڑی بُرائی ہے کہ وہ بُرائیوں کے پلڑے کو لازماً جھکا دے گی اور کافر کی کوئی نیکی ایسی نہ ہوگی کہ بھلائیوں کے پلڑے میں اس کا کوئی وزن ہو جس سے اُس کی نیکی کا پلڑا جھک سکے۔ البتہ مومن کے پلڑے میں ایمان کا وزن بھی ہوگا اور اس کے

ہو گی۔[۵] اور تمہیں کیا خبر کہ وہ کیا چیز ہے؟ بھڑکتی ہوئی آگ۔[۶] ع

ساتھ اُن نیکیوں کا وزن بھی جو اس نے دنیا میں کیں۔ دوسری طرف اُس کی جو بدی بھی ہو گی وہ بدی کے پلڑے میں رکھ دی جائے گی۔ پھر دیکھا جائے گا کہ آیا نیکی کا پلڑا جھکا ہوا ہے یا بدی کا۔

[۵] اصل الفاظ ہیں اُمُّهٗ هَاوِيَةٌ "اُس کی ماں ہاویہ ہو گی"۔ ہاویہ ہوی سے ہے جس کے معنی اونچی جگہ سے نیچی جگہ گرنے کے ہیں، اور ہاویہ اُس گہرے گڑھے کے لیے بولا جاتا ہے جس میں کوئی چیز گرے۔ جہنم کو ہاویہ کے نام سے اس لیے موسوم کیا گیا ہے کہ وہ بہت عمیق ہو گی اور اہلِ جہنم اس میں اوپر سے پھینکے جائیں گے۔ رہا یہ ارشاد کہ اس کی ماں جہنم ہو گی، اِس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ماں کی گود بچے کا ٹھکانا ہوتی ہے، اسی طرح آخرت میں اہلِ جہنم کے لیے جہنم کے سوا کوئی ٹھکانا نہ ہو گا۔

[۶] یعنی وہ محض ایک گہری کھائی ہی نہ ہو گی بلکہ بھڑکتی ہوئی آگ سے بھری ہوئی ہو گی۔

حلال و حرام کی اخلاقی اور رُوحانی بُنیادیں

شیخ یُوسف القرضاوی
ترجمہ: عبدالحمید صدیقی

اسلام پسندیدہ اور نفیس محرکات، شریفانہ مقاصد اور پاکیزہ عزائم کی اپنی جملہ قانون سازیوں میں قدر کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "اعمال کی بنیاد نیتوں پر ہے اور ہر شخص کے لیے وہی ہے جو اُس نے نیت کی"[1] نیک نیتی سے شریعت میں جائز امور اور معمولاتِ زندگی عبادت اور قربِ الٰہی کا باعث بن جاتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص زندگی کی حفاظت اور جسم کی تقویت کے لیے خوراک کھائے اور اُس کی نیت یہ ہو کہ اس طرح وہ خدا اور قوم کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داریوں کو بحُسن و خوبی انجام دے سکے گا تو اُس کا کھانا پینا عبادت اور باعثِ قربِ الٰہی ہوگا۔ نیز اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے جماع کرے اور اس کی نیت یہ ہو کہ اُس کے ہاں بچہ تولّد ہو اور وہ خود اپنے آپ کو اور اپنی بیوی کو پاک دامن رکھ سکے تو اس کا یہ جماع کرنا عبادت ہوگی جس پر اللہ اُسے اجر و ثواب دے گا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "تم میں ہر شخص کے ذکر میں بھی فائدہ اور اجر ہے۔ لوگوں نے پوچھا: "اے اللہ کے رسولؐ! اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس اپنی شہوت کو پورا کرنے کے لیے آتے تو کیا اس کے لیے اس کام میں کوئی اجر و ثواب ہے؟" آپؐ نے جواب دیا: "اگر وہ شخص اپنی خواہش کو حرام طریقے سے پورا کرتا تو کیا اس پر گناہ نہ ہوتا؟ اسی طرح جب وہ حلال طریقے سے اپنی خواہش کو پورا کرے گا تو اجر و ثواب کا مستحق ہوگا"[2] نیز فرمانِ نبویؐ ہے کہ جس شخص نے حلال طریقے سے دنیاوی مال و منال طلب کیا اور اس کی نیت یہ ہو کہ وہ لوگوں سے سوال کرنے سے بچ جائے، اہل و عیال کو روزی مہیا کر سکے، اور اپنے ہمسائے کے ساتھ نیک برتاؤ کر سکے تو وہ قیامت کے دن خداوندِ عالم سے یوں ملے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی

[1] بخاری [2] بخاری و مسلم

طرح چمک رہا ہو گا۔[1]" اس سے ثابت ہوا کہ مومن کے ہر جائز کام میں نیت کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے جو اُس کام کو عبادت کے درجے تک لے جاتا ہے۔ مگر حرام اور ناجائز کام حرام ہی ہے خواہ اس کے کرنے والے کی نیت کتنی ہی نیک ہو اور اس کا مقصد و منتہا کتنا ہی بلند و عظیم ہو اور اسلام میں یہ بات ہرگز پسندیدہ نہیں کہ کسی حرام کام کو کسی نیک مقصد کے حصول کا ذریعہ بنا یا جائے۔ کیونکہ اسلام جہاں مقصد و منتہا کے نیک ہونے کا خواہاں ہے وہیں وہ اس مقصد کے حصول کے ذریعے کے بھی پاکیزہ اور مطہر ہونے پر زور دیتا ہے۔ وہ ہرگز اس اصول کو نہیں مانتا کہ THE ENDS SANCTIFY THE MEANS (مقاصد ذرائع کو مقدس بنا دیتے ہیں) یا یہ کہ سچائی تک پہنچنے کے لیے بہت سے باطل طریقوں کو بھی اختیار کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس اسلام اس بات کا قائل ہے کہ سچائی اور حق کو صرف جائز اور حق و انصاف پر مبنی طریقوں ہی سے حاصل کیا جانا چاہیے۔

اگر کوئی شخص سُود، حرام کمائی یعنی رشوت وغیرہ، ناجائز کھیل تماشے، قمار بازی یا شریعت کی رُو سے کسی بھی ممنوع طریقے سے مال جمع کرے اور اس کی نیت یہ ہو کہ وہ اس مال سے کوئی مسجد تعمیر کروائے گا یا کوئی خیراتی ادارہ قائم کرے گا تو یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اس نیک مقصد اور حُسنِ نیت کی وجہ سے وہ ارتکابِ جرم کے گناہ کی سزا سے بچ جائے۔ کیونکہ جو چیز اسلام میں حرام ہے اُس پر حُسنِ نیت اور بلندیِ مقاصد کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان میں ہمیں یہی تعلیم دی گئی ہے کہ "انّ اللہ طیب لا یقبل الا طیبا (اللہ پاک ہے اور صرف پاکیزہ اشیاء و امور ہی کو قبول فرماتا ہے) اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں اور مومنوں کو ایک ہی حکم دیا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

یٰاَیُّہَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ۔ (مومنون ۵۱)	اے پیغمبرو! کھاؤ پاک چیزیں اور عمل کرو صالح تم جو کچھ بھی کرتے ہو میں اس کو خوب جانتا ہوں۔
یٰاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ۔ (بقرہ: ۱۷۲)	اے ایمان والو! جو پاک چیزیں ہم نے تمہیں بخشی ہیں انہیں بے تکلف کھاؤ۔

پھر آپ نے فرمایا کہ "ایک شخص ہے جو حج یا عمرہ وغیرہ کے لیے بڑی طویل مسافت طے کر کے آیا ہے

[1] بخاری و مسلم

اور اس کے بال پراگندہ اور غبار آلود ہیں اور آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا پھیلا کر کہتا ہے "اے میرے رب! اے میرے رب!!" مگر اس کا کھانا، پینا اور پہننا سب کچھ حرام کے مال سے ہوتا ہے تو ایسے شخص کے لیے درِ اجابت کیونکر کھلے گا؟[1]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جو شخص حرام مال جمع کرتا ہے اور پھر اس میں سے راہِ خدا میں دیتا ہے تو وہ کسی قسم کے اجر کا مستحق نہیں ہوگا اور اس حرام کمائی کا وبال اُسی پر ہوگا۔[2]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: اگر ایک بندہ حرام مال کماتا ہے، پھر اُسے صدقہ کرتا ہے اور وہ اُس سے قبول کر لیا جاتا ہے اور وہ اُس میں سے خرچ کرتا ہے اور اُس کے لیے اس مال میں برکت بھی ڈال دی جاتی ہے اور پھر وہ اُسے اپنے پیچھے چھوڑ مرتا ہے تو ایسا مال اس بندے کے لیے دوزخ کی زادِ راہ بنے گا۔ بیشک اللہ تعالیٰ برائی اور بُرائی سے نہیں مٹاتا بلکہ بُرائی کو نیکی سے مٹاتا ہے اور ناپاک چیز کو ناپاک چیز نہیں مٹا سکتی۔[3]

شبہات سے بچاؤ اللہ تعالیٰ کا یہ خاص کرم ہے کہ اُس نے حلال و حرام کے معاملے میں لوگوں کو یُونہی نہیں چھوڑ دیا کہ جو چاہیں کرتے پھریں۔ بلکہ حلال اور حرام کو بالکل واضح طور پر الگ الگ کر کے بیان فرما دیا ہے جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قد فصل لکم ما حرم علیکم (اللہ نے جو چیزیں تم پر حرام کی ہیں وہ اُس نے کھول کھول کر بیان کی ہیں)۔ جہاں تک حلالِ بیّن کا تعلق ہے تو اُس پر عمل کر لینے میں بالکل کوئی حرج نہیں۔ مگر حالتِ اختیار میں حرامِ بیّن پر عمل کرنے کی قطعاً اجازت نہیں۔

حلالِ بیّن اور حرامِ بیّن کے درمیان ایک حلقۂ عمل ہے اور یہ ہے اُن شبہات کا حلقۂ عمل جن کی وجہ سے بعض لوگ حلال کو حرام کے ساتھ گڈمڈ کر دیتے ہیں۔ اس کی دو وجوہات ہیں ایک یہ کہ حلال و حرام کے دلائل غیر واضح ہوں۔ دوسرے یہ کہ کسی نصِّ قرآنی کو واقعہ زیرِ نظر یا مسئلہ زیرِ بحث کے ساتھ تطبیق میں غلطی ہو جائے یا شبہ رہ جائے۔ ایسی صورت میں پرہیزگاری اور تقوے کا تقاضا یہی ہے

[1] مسلم و ترمذی [2] ابن خزیمہ و ابن حبان و حاکم [3] احمد وغیرہ

کہ ان شبہات سے بالکل اجتناب کیا جائے۔ مبادا یہ شبہات حرام بیّن کے ارتکاب کا سبب بن جائیں۔ اس اصول کا ماخذ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا یہ فرمان ہے کہ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور ان کے درمیان کچھ غیر واضح امور ہیں جنہیں اکثر لوگ نہیں جانتے کہ وہ حلال ہیں یا حرام؟ پس جس شخص نے اپنے دین اور اپنی عزت و آبرو کو بچانے کے لیے ان غیر واضح امُور کو چھوڑ دیا وہ سلامت رہا اور جس شخص نے اُن میں سے کسی ذرا سی بات پر بھی عمل کیا تو کوئی بعید نہیں کہ وہ حرامِ بیّن میں پڑ جائے جیسے اگر کوئی شخص ممنوعہ چراگاہ (وہ چراگاہ جسے کسی بادشاہ نے صرف اپنے جانوروں کے چرنے کے لیے بنا رکھا ہو اور کسی دوسرے شخص کو اس میں اپنے جانور چرانے کی اجازت نہ ہو) کے اردگرد اپنے جانور چرائے تو ہو سکتا ہے کہ اس کے جانور چراگاہ کے اندر کی گھاس پر بھی جا پڑیں۔ سنو! ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ کی چراگاہ اس کی حرام کردہ اشیاء و افعال ہیں۔

حرام سب پر حرام ہے: شریعتِ اسلام میں حرام میں ہمہ گیری پائی جاتی ہے۔ یعنی جو چیز حرام ہے وہ جملہ اہلِ اسلام کے لیے حرام ہے۔ یہ نہیں کہ کوئی چیز عجمی کے لیے تو حرام ہو مگر عربی کے لیے حلال۔ اور ایک چیز کالے کے لیے حرام ہو اور گورے کے لیے حلال۔ اور کسی طبقے یا گروہ کو ہرگز اس بات کی اجازت یا رخصت نہیں دی گئی کہ وہ خواہشِ نفس کی پیروی میں جو چاہے کرے خواہ وہ پیرانِ طریقت ہوں یا علماء، بادشاہ اور شرفاء ہوں۔ بلکہ اس سلسلے میں مسلمان ہونا بھی کوئی ایسی خوبی نہیں جو کسی مسلمان کے لیے کسی ایسی چیز کو حلال کر دے جو دوسروں پر حرام ہے۔ اللہ جل شانہٗ سب کا رب ہے اور شریعتِ الٰہی عالمگیر ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے جو چیز حلال کی ہے وہ جملہ بنی نوعِ انسان کے لیے حلال ہے اور جو چیز اس نے حرام کی ہے وہ قیامت تک سب کے لیے حرام ہوگی۔ مثلاً اسلام میں چوری حرام ہے خواہ چوری کرنے والا مسلمان ہو یا غیر مُسلم اور جس کی چوری ہوئی ہے وہ بھی مسلمان ہو یا غیر مُسلم۔ اور چور کو چوری کی سزا ضرور دی جائے گی خواہ وہ حسب و نسب اور مقام و مرتبہ کے اعتبار سے کتنی بھی بلند شخصیت ہو۔ اس ضمن میں حضور نبی کریم علیہ التحیۃ والسلام کا یہ فرمان ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے: وایم اللہ! لو سرقت فاطمۃ بنت محمد لقطعت یدھا (اللہ کی قسم! اگر فاطمہ بنتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے میں ایک چوری کا ارتکاب ہو گیا اور ایک یہودی اور ایک مسلمان پر چوری کا شبہ ظاہر کیا گیا۔ مسلمان کے بعض رشتہ داروں نے بعض آثار و قرائن کو مدِنظر

رکھتے ہوئے یہودی پر چوری کا الزام تھوپ دیا اور اپنے مسلمان بھائی کو اس سے بری الذمہ قرار دیا جو فی الواقع چوری کا مرتکب ہوا تھا۔ قریب تھا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہودی کے خلاف فیصلہ صادر فرما دیتے۔ اتنے میں وحی آئی جس نے خائنوں کو بے نقاب کیا۔ یہودی کی برات فرمائی اور رسول اللہ کو تنبیہ کی اور حق کو قائم کیا۔ ارشاد خداوندی ہے:

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا وَاسْتَغْفِرِ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ الْقَوْلِ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا هَا أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ جَادَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَمَن يُجَادِلُ اللَّهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَم مَّن يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا۔

(نساء: ۱۰۵-۱۰۹)

اے نبی! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو راہِ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔ تم بد دیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے نہ بنو اور اللہ سے درگزر کی درخواست کرو، وہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے۔ جو لوگ اپنے نفس سے خیانت کرتے ہیں تم ان کی حمایت نہ کرو۔ اللہ کو ایسا شخص پسند نہیں جو خیانت کار اور معصیت پیشہ ہو۔ یہ لوگ انسانوں سے اپنی حرکات چھپا سکتے ہیں مگر خدا سے نہیں چھپا سکتے۔ وہ تو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ راتوں کو چھپ کر اس کی مرضی کے خلاف مشورے کرتے ہیں۔ ان کے سارے اعمال پر اللہ محیط ہے۔ ہاں! تم لوگوں نے ان مجرموں کی طرف سے دنیا کی زندگی میں تو جھگڑا کر لیا، مگر قیامت کے روز ان کی طرف سے کون جھگڑے گا؟

موجودہ تحریف شدہ یہودی مذہب میں ہے اگر کوئی یہودی اپنے یہودی بھائی کو قرض دے تو اس کے لیے سود لینا حرام ہے مگر کسی غیر یہودی کو سود پر قرض دینے میں کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ تورات کی کتابوں میں سے پانچویں کتاب استثناء میں لکھا ہے "اپنے بھائی کو دام و درہم، کھانے یا کسی چیز کے سود پر وہ چیز قرض نہ دو جو کسی اجنبی کو سود پر دی جاتی ہے۔ تم اجنبی کو تو سود پر قرض دے سکتے ہو مگر اپنے بھائی یہودی کو سود پر قرض نہیں دے سکتے۔"

قرآن مجید نے یہودیوں کی اس ذہنیت کو کہ وہ ہر غیر یہودی کے ساتھ خیانت کو جائز سمجھتے تھے اور اس میں کوئی حرج یا گناہ نہیں سمجھتے تھے، یُوں ذکر کیا ہے:

وَمِنْهُم مَّنْ إِن تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لَّا يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ۔ (آل عمران: ۷۵)

اہلِ کتاب میں سے کسی کا حال یہ ہے کہ اگر تم ایک دینار کے معاملے میں بھی اس پر بھروسہ کرو تو وہ ادا نہ کرے گا الّا یہ کہ تم اُس کے سر پر سوار ہو جاؤ، ان کی اس اخلاقی حالت کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں اُمیوں (غیر یہودی لوگوں) کے معاملہ میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں اور یہ بات وہ محض جھوٹ گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ نے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی ہے۔

بلاشک یہودی اللہ پر جھوٹ ہی تو باندھتے ہیں۔ کیونکہ شریعتِ الٰہی میں سب لوگ برابر ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے خیانت کو جملہ انبیاء اور رسولوں کی زبانِ وحی ترجمان سے حرام فرمایا ہے۔

ہم بڑے افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ یہودی ذہنیت سراسر وحشیانہ اور جاہلانہ ذہنیت ہے۔ جس کی نسبت کسی آسمانی دین کی طرف کرنا ٹھیک نہیں کیونکہ اخلاق فاضلہ بلکہ اخلاقِ صحیحہ وہی ہوتے ہیں جن میں ہمہ گیری اور عمومیت پائی جاتی ہو، ایسا نہ ہو کہ ایک چیز زید کے لیے حلال کر دی گئی ہو مگر بکر کے لیے وہی چیز ممنوع و حرام ہو۔ ہمارے اور قدیم دورِ جہالت کے باشندوں میں فرق ہی یہ ہے کہ ہمارے ہاں اخلاقیات کے دائرے میں جو وسعت پائی جاتی ہے وہ اُن کے ہاں نہیں تھی۔ مثلاً امانتداری اُن کے نزدیک ایک قابلِ ستائش خصلت تھی۔ مگر خاص طور پر اُس وقت جب ایک ہی قبیلہ کے افراد ایک دوسرے سے لین دین میں امانت و دیانت کو ملحوظِ خاطر رکھیں اور جب قبیلے سے باہر کے لوگوں سے معاملہ پیش آئے تو پھر خیانت کی اجازت تھی بلکہ واجب تھی۔ چنانچہ "تہذیب کی کہانی" کا مصنف لکھتا ہے:

"قدیم زمانے میں بنی نوعِ انسان کے جتنے بھی گروہ پائے جاتے تھے وہ سب کے سب اس بات میں یکساں تھے کہ اُن میں سے ہر ایک یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ اس کے علاوہ دیگر سب گروہ اُس سے فروتر ہیں۔ چنانچہ شمالی امریکہ کے قدیم باشندے اپنے آپ کو خدا کی برگزیدہ قوم سمجھتے تھے اُن کا یہ عقیدہ

تھا کہ انہیں "روح اعظم" نے خاص طور پر اس غرض کے لیے پیدا کیا ہے کہ وہ نوعِ بشر کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ بن سکیں۔ ہندوستان میں ایک قبیلہ ایسا تھا کہ وہ لفظ "انسان" کا اطلاق صرف اپنے اوپر کرتے تھے اور کہتے تھے ہمارے سوا کوئی انسان نہیں بعض قبیلے ایسے تھے جو کہتے تھے کہ انسانوں میں انسان ہیں تو ہم" اس کا نتیجہ یہ تھا کہ زمانہ قدیم کے انسان کے دل میں کبھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ وہ دوسرے قبائل کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے بھی انہی اخلاقی حدود و قیود کی پابندی کرے جن کی کہ وہ اپنے قبیلہ کے ساتھ معاملہ کرنے میں کرتا ہے۔ اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ پرانے زمانے میں اخلاق کا کام صرف یہ تھا کہ اسے مختلف گروہوں اور قبیلوں کے افراد دوسرے قبیلوں کے مقابلے میں اپنے قبیلے یا گروہ کی تقویت اور پشت پناہی کے لیے اپناتے تھے۔ اخلاقی اوامر و نواہی کو صرف اپنے ہی اہلِ قبیلہ سے معاملات کرتے ہوئے درخورِ اعتنا سمجھا جاتا تھا۔ رہے دوسرے قبیلوں کے افراد تو جب تک وہ اِن کے مہمان نہ ہوں یہ ہر نوع ان سے معاندانہ رویہ رکھنے کو جائز سمجھتے تھے"

حاجت سے مجبور کے لیے کوئی قانون نہیں[1] پہلے اسلام نے صرف محرّمات (حرام کردہ اشیاء و افعال) کا دائرہ تنگ کیا، پھر حرام کے معاملہ میں اتنی شدت اختیار کی کہ حرام کی طرف لے جانے والے سارے ظاہری اور پوشیدہ راستوں کو مسدود کر دیا یعنی اس طرح کے احکام دیئے کہ جو چیز حرام کی طرف رہنمائی کرے وہ بھی حرام ہے، جو چیز ارتکابِ حرام میں ممد و معاون ہو وہ بھی حرام ہے اور جس چیز کے حرام پر حیلہ سازی کی جا سکتی ہے وہ بھی حرام ہے وغیرہ وغیرہ۔ بایں ہمہ اسلام نے زندگی کی ضرورتوں اور اُن کے سامنے انسان کی کمزوری اور بے بسی کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ شدید ضرورت اور انسانی بے بسی کا اندازہ کرتے ہوئے کسی شدید ضرورت کے دباؤ کے تحت مسلمان کے لیے اس بات کو جائز کر دیا کہ وہ حرام شدہ چیز سے بقدرِ ضرورت اور اپنے آپ کو ہلاکت سے بچانے کے لیے مناسب مقدار لے سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ محرّماتِ خورد و نوش یعنی مُردار، خون اور سؤر کے گوشت کا ذکر کرنے کے بعد فرماتا ہے:

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (البقرہ: ۱۷۳)

پس جو شخص لاچار ہو جائے اور حکم عدولی اور زیادتی کرنے کا اُسے مطلق خیال نہ ہو اُن میں سدِ رمق کھائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بیشک اللہ بہت بخشنے والا اور نہایت رحم والا ہے۔

---

[1] NECESSITY KNOWS NO LAW

محرمات خورد و نوش کے ذکر کے ساتھ اس بات کو قرآنِ مجید کی چار سورتوں میں دُہرایا گیا ہے انہی آیات اور اس طرح کی دوسری آیات کو تدنظر رکھتے ہوئے فقہائے اسلام نے یہ اہم اصول مقرر فرمایا ہے کہ ان الضرورات تبیح المحظورات (حاجت سے مجبور انسان کے لیے کوئی قانون نہیں)۔

لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ ان آیات میں مجبور اور لاچار شخص کو اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ غیر باغٍ ولا عادٍ ہو اور ان الفاظ کی تفسیر یوں کی گئی ہے کہ وہ طالبِ لطف و لذت نہ ہو اور کھانے میں اپنی حدِ احتیاج سے تجاوز کرنے والا نہ ہو۔ اس پابندی سے فقہاء نے ایک اور اصول اخذ کیا ہے کہ الضرورۃ تقدر بقدرھا (ضرورت کا اندازہ قدرِ ضرورت سے کیا جاتا ہے) لہٰذا اگر کوئی انسان کسی حاجت سے مجبور ہو جائے تو اُسے اُس حاجت کے محرکات کا تابعِ مہمل بن کر اپنے غور و فکر کی زمام انہی کے سپرد نہیں کر دینی چاہیے بلکہ اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اصلِ حلال سے وابستہ رہے، مبادا وہ کسی ضرورت کی وجہ سے حرام کو خوشگوار اور مرغوبِ خاطر سمجھنے لگ جائے۔

اسلام نے اگر احتیاجات کے وقت ممنوع اور حرام چیزوں کو حلال کیا ہے یہ اس عام قاعدۂ کلیہ کے مطابق ہے جس میں تنگی اور تکلیف کے بجائے آسانی اور سہولت کی رُوح کار فرما ہے اور جس کا مقصد اُمتِ مُسلمہ سے اُن بندھنوں اور جکڑ بندیوں کو دُور کرنا ہے جن کا پابند پہلی قوموں کو کیا گیا تھا۔ خداوندِ بزرگ و برتر نے سچ کہا ہے:

يُرِيدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ۔ (سورۂ بقرہ: ۱۸۵)	اللہ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے، سختی نہیں کرنا چاہتا۔
مَا يُرِيدُ اللهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ (مائدہ: ۶)	اللہ تم پر زندگی کو تنگ نہیں کرنا چاہتا مگر وہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دے شاید کہ تم شکر گزار بن جاؤ۔
يُرِيدُ اللهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا۔ (نسا: ۲۸)	اللہ تم پر سے پابندیوں کو ہلکا کرنا چاہتا ہے کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

مسلمان کی شخصی زندگی اور حلال و حرام | خورد و نوش: مختلف اقوام و ملل کا زمانۂ قدیم سے اس امر میں اختلاف رہا ہے کہ وہ کیا کھائیں اور کیا پئیں، اور خاص طور پر حیوانی اشیائے خوردنی میں اُن کے لیے کیا جائز ہے اور

کیا ناجائز۔ رہیں نباتاتی اشیائے خورد و نوش تو اُن کے بارے میں کوئی لمبے چوڑے اختلافات معروف و معلوم نہیں اور اسلام نے بھی ان چیزوں میں سے اُن کو حرام کیا ہے جو شراب بن گئی ہوں۔ مثلاً انگور، کھجور، جو یا کوئی دوسری چیز جب نشہ آور بن جائے تو حرام ہے۔ اسی طرح اسلام میں وہ چیزیں بھی حرام ہیں جو اعضائے جسمانی کو بے حسی اور فتور میں مبتلا کر دیں یا جسم کو کسی قسم کا نقصان پہنچائیں۔ جہاں تک حیوانی اشیائے خوردنی کا تعلق ہے تو اُن کے بارے میں مختلف قوموں اور گروہوں میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔

جانور کو ذبح کر کے کھانے کے متعلق برہمنوں کا نقطۂ نظر کچھ انسانی گروہ ایسے بھی ہیں مثلاً برہمن اور بعض فلسفہ زدہ لوگ جو کسی جانور کو ذبح کر کے کھانا اپنے لیے حرام سمجھتے ہیں اور محض نباتاتی غذاؤں پر زندہ رہتے ہیں وہ کہتے ہیں، جانور کو ذبح کر کے انسان اپنے جیسی ایک زندہ مخلوق پر ظلم و زیادتی کا مظاہرہ کرتا ہے اُسے کوئی حق نہیں کہ وہ کسی جانور کو زندگی کے حق سے محروم کرے۔

نظامِ کائنات پر غور و فکر کرنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان جانوروں کو پیدا کرنے کا فی نفسہٖ کوئی مقصد نہیں۔ کیونکہ انہیں عقل و ارادہ سے محروم رکھا گیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قدرت کی طرف سے انہیں جو مقام دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اُسے انسان کی خدمت کے لیے مسخر کیا جاتا ہے۔ جو انسان کسی جانور کو مسخر کر کے اُس سے صحیح طور پر فائدہ اٹھاتا ہے تو اگر وہ اُس جانور کو ذبح کر کے اُس کے گوشت سے فائدہ حاصل کرتا ہے تو یہ کوئی عجیب و غریب بات نہیں۔

اسی طرح کائنات پر غور کرنے سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مخلوقات کی پیدائش کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سُنّت یہ رہی ہے کہ مخلوق کی ادنیٰ قسم کو اعلیٰ قسم کے فائدے کے لیے قربان کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ سرسبز و شاداب نباتات کو حیوان کی غذا کے لیے کاٹ لیا جاتا ہے اور جانور کو انسان کی غذا کے لیے ذبح کیا جاتا ہے بلکہ خود انسان بھی جنگ کرتا ہے اور جملہ مخلوقات کے فائدے اور مفاد کے لیے قربان ہو جاتا ہے۔

تاہم انسان اگر جانوروں کو ذبح کرنے سے باز آ جائے تو اس سے جانور موت اور تباہی سے نہیں بچ سکتے اگر کوئی بڑا اور طاقتور جانور کسی چھوٹے اور کمزور جانور کو پھاڑ نہیں کھائے گا تو وہ یقیناً اپنی طبعی موت مر جائے گا۔ اور ہو سکتا ہے کہ جانوروں کا پھاڑ کھانا یا طبعی موت مرنا اس کے لیے

ایک تیز دھار چھری سے ذبح ہونے کی نسبت زیادہ تکلیف دہ ہو۔

یہود و نصاریٰ کے نزدیک جو جانور حرام ہیں

اہلِ کتاب کے جملہ مذاہب میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں پر بہت سے بری و بحری جانور حرام ہیں جن کا مفصّل ذکر تورات کی اس کتاب کے گیارہویں باب میں ملتا ہے جو حضرت یعقوب علیہ السّلام کے بیٹے لاوی کے قبیلے کے افراد سے متعلق ہے۔ قرآن مجید میں بعض اُن چیزوں کا ذکر ملتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں پر حرام کر دیا تھا اور یہ سزا تھی اُن کے اپنے گناہوں اور بے اعتدالیوں کی جو اللہ نے انہیں دی تھی۔

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُم بِبَغْيِهِمْ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ۔ (الانعام: ۱۴۶)

اور جن لوگوں نے یہودیت اختیار کی اُن پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے اور گائے اور بکری کی چربی بھی بجز اُس کے جو اُن کی پیٹھ یا اُن کی آنتوں سے لگی ہوئی ہو یا ہڈی سے لگی رہ جاتی۔ یہ ہم نے اُن کو سرکشی کی سزا دی تھی اور یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔

یہ تو یہودیوں کی حالت تھی مگر نصاریٰ نے بھی اُن کی پیروی کی۔ انجیل میں صاف طور پر اس بات کا اعلان کیا گیا ہے کہ مسیح علیہ السّلام دنیا میں اس لیے نہیں آئے کہ قانونِ الٰہی کو توڑیں بلکہ وہ اس کی تکمیل کے لیے تشریف لائے تھے مگر نصاریٰ نے قانونِ الٰہی کو توڑا اور تورات میں جو چیزیں اُن کے لیے حرام کی گئی تھیں اور جن کی حرمت کو انجیل نے منسوخ نہیں کیا تھا وہ سب انہوں نے اپنے لیے حلال کر لیں۔ انہوں نے جملہ اشیا سے خورد و نوش دسوائے اس کے جو بتوں کے لیے ذبح کیا گیا ہو اور اس کے متعلق مسیحیت کے پیرو کو یہ بتا دیا گیا ہو کہ یہ بت کے لیے ذبح کیا گیا ہے) کو سینٹ پال کی پیروی کرتے ہوئے حلال کر لیا اس سلسلے میں سینٹ پال کا طرزِ استدلال یوں تھا کہ پاکیزہ لوگوں کے لیے ہر چیز پاک ہے اور مُنہ میں داخل ہونے والی کوئی چیز مُنہ کو ناپاک نہیں کرتی بلکہ اُسے ناپاک تو وہ چیز کرتی ہے جو اُس میں سے خارج ہوتی ہے اسی اصول کو مدِّنظر رکھتے ہوئے نصاریٰ نے سؤر کا گوشت کھانا حلال قرار دے لیا تھا باوجود اس کے کہ وہ نصِّ تورات سے آج تک حرام ہے۔

زمانہ جاہلیت کے عربوں کے نزدیک جو جانور حرام تھے

جہاں تک دَورِ جاہلیت کے عربوں کا تعلق ہے تو

انہوں نے بھی بعض جانوروں کو محض نفرت کی بنا پر اپنے اُوپر حرام کیا ہوا تھا اور بعض کو اس لیے حرام کیا ہوا تھا کہ وہ اُن کے لیے عبودیت کے جذبات اپنے اندر رکھتے تھے اور بتوں کا تقرّب اُن کا انتہائے مقصود تھا اور وہ اوہام پرستی میں مبتلا تھے مثلاً بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام۔ اُن کی تفسیر پہلے ذکر کی جاچکی ہے۔ اور ان کے مقابلے میں انہوں نے بہت سی ناپاک چیزوں کو اپنے اُوپر حلال کیا ہوا تھا۔ مثلاً مُردار اور بہایا ہوا خون وغیرہ۔

اسلام پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے جب اسلام ظہور پذیر ہوا تو حیوانی اشیائے خورونوش کے معاملے میں لوگوں کی یہی حالت تھی کہ وہ بعض چیزوں کو کھانے اور بعض کو ترک کرنے میں انتہا پسندانہ طرزِ عمل اختیار کیے ہوئے تھے۔ قرآنِ مجید میں ساری انسانی برادری کو مخاطب کرکے کہا گیا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ (البقرہ: ۱۶۸)

لوگو! زمین میں جو حلال اور پاک چیزیں ہیں انہیں کھاؤ اور شیطان کے بتائے ہوئے رستوں پر نہ چلو۔ وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے۔

اس آیت میں سارے انسانوں کو پکار کر کہا گیا ہے کہ وہ اس بہت بڑے دسترخوان سے پاک چیزیں کھائیں جسے اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے بچھایا ہے۔ یہ دسترخوان ساری زمین ہے جو اور جس کی ساری چیزیں انسانوں کیلیے پیدا کی گئی ہیں۔ اور یہ کہ وہ شیطانی راہوں پر نہ چلیں جو شیطان نے بعض لوگوں کے سامنے مزیّن کرکے پیش کی ہیں اور وہ لوگ اللہ کی حلال کردہ چیزیں حرام ٹھہراتے ہیں اور پاک اور حلال چیزوں سے انہیں محروم کرتے ہیں اور انہیں گمراہی وضلالت کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینک دیتے ہیں:

پھر قرآن مجید میں صرف مومنوں کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ۔ (البقرہ: ۱۷۲-۱۷۳)

اے ایمان والو! اگر تم حقیقت میں اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو تو جو پاک چیزیں ہم نے تمہیں بخشی ہیں انہیں بے تکلف کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو۔ اللہ کی طرف سے اگر کوئی پابندی تم پر ہے تو وہ یہ ہے کہ مُردار نہ کھاؤ خون اور سؤر کے گوشت سے پرہیز کرو اور کوئی ایسی چیز نہ کھاؤ جس پر کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔ ہاں جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو اور وہ ان میں سے کوئی چیز کھالے بغیر اس کے کہ وہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو یا ضرورت کی حد سے

تجاوز کرے تو اس پر کچھ گناہ نہیں، اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس دعوت میں جس کا رُو ئے سخن خاص مومنوں کی طرف ہے اللہ جل شانہٗ ایمانداروں کو حکم دیتا ہے کہ جو پاک چیزیں اُس نے انہیں بخشی ہیں وہ انہیں بے تکلف کھائیں اور اُس منعمِ حقیقی کا شکر ادا کر کے حقِ نعمت ادا کریں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر یہ فرمایا ہے کہ اُس نے آیتِ بالا میں مذکور صرف چار قسم کی چیزوں سے منع کیا ہے سُورہ انعام میں ان چار قسم کی حرام شدہ چیزوں کا اور بھی وضاحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے:

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْمَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (انعام۔ ۱۴۵)

اے محمدؐ! ان سے کہو کہ جو وحی میرے پاس آئی ہے اس میں تو میں کوئی چیز ایسی نہیں پاتا جو کسی کھانے والے پر حرام ہو، اِلّا یہ کہ وہ مُردار ہو یا بہایا ہوا خون ہو یا سؤر کا گوشت ہو کہ ناپاک ہے یا فسق ہو کہ اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔ پھر جو کوئی مجبوری کی حالت میں (کوئی چیز ان میں سے کھالے) بغیر اس کے کہ وہ نافرمانی کا ارادہ رکھتا ہو اور بغیر اس کے کہ وہ حدِ ضرورت سے تجاوز کرے تو یقیناً تمہارا رب درگزر سے کام لینے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

اور سُورہ مائدہ میں اللہ تعالیٰ نے ان حرام کردہ چیزوں اور بھی زیادہ تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِیْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّیَةُ وَالنَّطِیْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّیْتُمْ ۟ وَمَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ (مائدہ: ۳)

تم پر حرام کیا گیا مُردار، خون، سؤر کا گوشت، وہ جانور جو خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو اور جو گلا گھٹ کر یا چوٹ کھا کر یا بلندی سے گر کر یا ٹکر کھا کر مرا ہو یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو۔ سوائے اس کے جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کر لیا۔ اور وہ کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو۔

اس آیت میں جو حرام کردہ چیزوں کی تعداد دس بتائی ہے اور گذشتہ آیات میں جو حرام کردہ اشیاء کی تعداد چار بتائی ہیں، صرف یہ فرق ہے کہ یہ آیت ان آیات کی تفصیل و تشریح ہے کیونکہ جو گلا گھٹ کر یا چوٹ کھا کر یا بلندی سے گر کر یا ٹکر کھا کر مرا ہو یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو، سب مُردار کے تحت آتے ہیں۔ اسی طرح جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو وہ اُس جانور کے حکم میں آتا ہے جو خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔ پس اگر اجمالاً ذکر کیا جائے تو حرام کردہ چیزیں چار ہیں اور اگر مفصل طور پر بیان کیا جائے تو وہ چیزیں دس ہیں۔

اشتراکی رُوس میں مُسلمان

اور

اِسلام سے متعلق رُوسیوں کی معاندانہ روش

(حاجی ایم - ترکستانی)

۱۹۷۰ء کے آخری ربع میں دو بین الاقوامی اسلامی کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ پہلی کانفرنس کا انعقاد افرو ایشیائی اسلامک آرگنائزیشن کے تحت ۷ اکتوبر سے ۱۱ اکتوبر تک نبڈونگ کے مقام پر ہوا اور دوسری کا اسلامک کال کے زیر اہتمام ۱۲ دسمبر سے ۱۶ دسمبر ۱۹۷۰ء تک طرابلس کے مقام پر۔ دونوں کانفرنسوں میں جو قرار دادیں منظور کی گئیں۔ وہ مستقبل میں دنیائے اسلام کی ترقی کے بارے میں نمایاں اہمیت کی حامل ہیں۔

طرابلس کے اجلاس میں اسلام کے خلاف اس پروپیگنڈے پر خاص توجہ دی گئی جو پوری دُنیا میں اس وقت جاری ہے۔ نیز اس معاندانہ پروپیگنڈے کے خلاف ایک مہم چلانے پر بھی زور دیا گیا۔ لیبیا کے وزیر اعظم معمر القذافی نے اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا: "لیبیا ایک مجاہد مُسلم قوم کا ملک ہے لہٰذا اسلام کے خلاف عیّارانہ اور مکّارانہ پروپیگنڈا کو شکست دینے کے لیے وہ اپنی ساری قوتوں اور صلاحیتوں کو مجتمع کر کے بروئے کار لائے گا۔"

اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کے ذرائع بہت وسیع ہیں مختلف افراد کے علاوہ متعدد سیاسی اور مذہبی گروہ اس میدان میں سرگرم عمل ہیں لیکن ان سب سے زیادہ خطرناک ایک طاقتور حکومت کا وہ سربراہ ہے جو ایک پوری قوم کے وسیع ذرائع کو اس ناپاک جنگ میں جھونک سکتا ہے جو عام طور پر مذہب کے خلاف اور بالخصوص اسلام کے خلاف لڑی جا رہی ہے۔ اس طاقتور حکومت سے میری مراد رُوس کی اشتراکی حکومت ہے۔ افرو ایشیائی اسلامک کانفرنس منعقدہ نبڈونگ میں بھی

یہ مسئلہ زیر بحث آیا۔ وہاں مختلف ممالک کے نمائندوں نے روسی مسلمانوں پر سوویٹ یونین کے استحصالی اور ظالمانہ طرز عمل کی مذمت میں ایک خصوصی قرارداد منظور کی۔

روسی حکومت نے وعدہ کیا کہ ۱۹۶۹ء کی مردم شماری کے نتائج دسمبر ۱۹۷۰ء تک شائع کر دیے جائیں گے لیکن وہ ابھی تک منظر عام پر نہیں آئے اس لیے ہم یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے کہ روس میں اس وقت کتنے مسلمان آباد ہیں۔ تاہم محتاط اندازہ یہ ہے کہ اب بھی وہاں ساڑھے تین، چار کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ ان مسلمانوں میں اکثریت ترکستانیوں کی ہے جو روسی حکومت کے زیر نگیں، روسی ترکستان، وو لگا اورل کی وادی۔ ماوراء قفقاز، شمالی قفقاز اور کریمیا کے علاقوں میں آباد ہے۔ ترکستان میں مسلمان آبادی ازبک، قازق، ترکمان، تاجیک، کرغیز اور قرہ کلپاک قبائل پر مشتمل ہے۔ تاتار اور باشقیر وولگا اورل کے علاقے میں رہتے ہیں۔ ماوراء النہر میں زیادہ تر آذربائیجانی آباد ہیں۔ شمالی کاکیشیا جوانمرد کوہستانی مسلمانوں کا گھر ہے۔ اور کریمیا میں ترکی تاتار آباد ہیں۔ یہ لوگ ساتویں اور نویں صدی کے مابین اسلام کی نعمت سے بہرہ ور ہوتے۔ معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی تاریخ میں ان لوگوں کے شاندار کارنامے اسی دور سے متعلق ہیں جب یہ مسلمان ہو چکے تھے۔ وسطی ایشیا اور یورپی روس میں اسلام کے دور عروج میں بخارا کو مرکز تہذیب اور سمرقند کو "شمشیر نور" سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ ابوجعفر بن موسیٰ الخوارزمی۔ ابونصر۔ الفارابی۔ ابوعلی ابن سینا۔ ابوریحان البیرونی، الغ بیگ، برہان الدین مرغینانی۔ محمد بن اسماعیل بخاری، سلطان بابر اور اسی پایہ کی اور بہت سی برگزیدہ ہستیوں نے ترکستان میں قیام کے دوران ہی اپنی تالیف و تصنیف کا شاندار کام سرانجام دیا۔

آہستہ آہستہ مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو روسی حکومت کے دائرۂ اختیار میں شامل کیا جاتا رہا۔ یہ سلسلہ ۱۵۵۲ء میں ظالم ایفان کے ہاتھوں قازان کی خانی کی تباہی سے شروع ہوا اور جب سرخ فوج نے ۱۹۱۹ء میں بخارا اور خیوا کی خانی کے علاقہ پر قبضہ کیا تو یہ سلسلہ مکمل ہو گیا۔ اس علاقہ پر روسی قبضہ کے بعد پوری چار صدیوں کی تاریخ سخت مزاحمت اور طویل اور خوفناک جنگوں کی تاریخ ہے جو روس میں زار کی شہنشاہیت، صوبائی خود مختاری کا دور حکومت اور سوویٹ اشتراکی سلطنت میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان تینوں حکومتوں کے عہد میں مذہبی عقائد، معاشرتی آداب اور قومی اختلافات کے باعث مسلمانوں کے ساتھ اچھوتوں کا سا سلوک کیا جاتا رہا۔

شروع شروع میں زارِ روس نے مفتوحہ علاقوں میں لوگوں کو عیسائی بنانے کی پالیسی کا آغاز کیا اور وولگا اور یورال کو اپنی خاص آماجگاہ بنایا۔ ۱۵۵۵ء میں اس انسانیت سوز طرزِ فکر و عمل کے ساتھ ساتھ تبدریج مساجد مسمار کرنے کا عمل شروع کر دیا گیا اور ان کی جگہ کلیساؤں کی تعمیر شروع ہوئی۔ مسلمانوں کی زمینوں کو زبردستی چھین کر عیسائیوں میں تقسیم کیا گیا اور بعد کے دور میں تو یہ مہم نہایت ظالمانہ انداز میں جاری رکھی گئی۔ ۱۷۴۲ء تک صرف صوبہ قازان ہی میں ۵۳۶ مساجد میں سے ۴۱۸ منہدم کی جا چکی تھیں۔ اس ایذا رسانی اور اقتصادی غارت گری کے خلاف مسلمانوں میں شدید ردِ عمل پیدا ہوا۔ اس مکمل دور کو زار حکومتوں کے خلاف عام مظاہروں، بغاوتوں اور تشدد پسند تحریکات کا دور کہا جاتا ہے۔

اس اندھی بہری جارحیت کے خلاف اسلامی قوتوں نے بھی بھرپور مزاحمت کی جس سے ملتِ اسلامیہ کا الگ قومی وجود نشو و نما پانے لگا۔ مسلمانوں کی یہ مزاحمت بیکار نہ گئی اور زار حکومت مسلمانوں کے خلاف اپنی معاندانہ روش بدلنے پر مجبور ہو گئی۔ ۱۷۸۸ء میں مسلمانوں کو اپنی تنظیمیں قائم کرنے کی باضابطہ طور پر اجازت مل گئی۔ اگلے سال ۱۷۹۹ء میں انہیں اسلامی کتب اور لٹریچر کی اشاعت کے اختیارات حاصل ہو گئے۔ مذہبی رواداری کا یہ طرزِ عمل ۱۹۱۷ء تک قائم رہا جب زار حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا۔ اس عرصہ میں مسلمانوں کو تھوڑی بہت مذہبی آزادی حاصل رہی۔ وہ بغیر کسی رکاوٹ کے اسلام کی تبلیغ کر سکتے تھے۔ شریعت کا قانون اُن کی معاشرتی زندگی میں نافذ رہا۔ اور دینی مدارس بھی قائم رہے۔ لیکن دینی مدارس میں قومی زبان کی تعلیم ممنوع تھی۔

صوبائی حکومتیں فروری ۱۹۱۷ء کے انقلاب میں قائم ہوئیں۔ ان کے عہد میں مسلمانوں کے سارے قومی مطالبات اگرچہ پورے نہ ہوئے تاہم مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی۔ دراصل ان حکومتوں نے زار کے عہدِ حکومت کی پالیسی کو قدرے اور وسعت دی اور مدارس میں بھی قومی زبان کی تعلیم کی اجازت دے دی گئی۔ مسلمانوں کے مزید مطالبات پر غور سے پیشتر ہی اکتوبر ۱۹۱۷ء میں بالشویک نے لینن کی قیادت میں صوبائی حکومتوں کا تختہ اُلٹ دیا اور اس طرح تاریخ میں پہلی بار مسلمانوں کو ایک ملحد اشتراکی حکومت سے واسطہ پڑا۔

سوویٹ اشتراکیت کی بنیاد مارکس کی جدلیاتی مادہ پرستی پر ہے اس لیے اس نظامِ حکومت کا

ایک مقصد عوام میں مذہب کی بنیادیں اکھاڑ کر مادہ پرستانہ نظریۂ حیات کو رواج دینا ہے۔ اسلام کے بارے میں بھی اس کا یہی ناپاک عزم ہے۔

اشتراکیت کا یہ نقطۂ نظر اسے عروج حاصل ہونے سے پہلے بھی سب پر عیاں تھا۔ ۱۹۰۹ء میں لینن نے "محنت کاروں کی جماعت کے مذہب کے ساتھ تعلق" نامی کتابچہ میں صاف صاف لکھ دیا تھا کہ "مارکس کا یہ مقولہ کہ مذہب عوام کے لیے ایک افیون ہے"، مارکسی فلسفہ کی بنیاد ہے۔ مارکسزم کی نگاہ میں موجودہ مذاہب، عبادت گاہیں اور مذہبی تنظیمیں سب کی سب سرمایہ داروں کی آلۂ کار ہیں جن کا مقصد استحصال کی حمایت کرنا اور محنت کشوں پر بے جا بوجھ لادنا ہے۔

مذہب کے متعلق لینن کا یہ نظریہ نہ صرف سٹالن کے دَورِ حکومت میں بطورِ اصول کار فرما رہا بلکہ خروشیف اور رُوس کی موجودہ قیادت بھی اسی پر کاربند ہے۔ البتہ اگر کوئی تبدیلی ہوئی ہے تو وہ صرف یہ کہ روسی حکمرانوں نے استبداد کے ہتھیار اور طریقِ کار میں کچھ تغیرات پیدا کر لیے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات مذہب کے متعلق اور خصوصاً اسلام کے متعلق وہ موقع و محل کی مناسبت سے منافقت سے بھی کام لیتے ہیں۔

اسلام کے متعلق سوویٹ پالیسی کو چار ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۸ء تک، دوسرا ۱۹۲۹ء سے ۱۹۴۱ء تک، تیسرا ۱۹۴۲ء سے جنگِ عظیم دوم کے اختتام تک اور چوتھا ۱۹۴۶ء کے آخر سے آج تک۔

اسلام کے ساتھ روسی مسلمانوں کی عقیدت اور محبت کے بارے میں اشتراکی پُوری طرح آگاہ تھے۔ انہوں نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ اگر حکومت نے اسلامی طرزِ زندگی کو بزورِ قوت ختم کرنے کی کوشش کی تو اسے ایک شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑیگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذہین و فطین انقلابی لینن نے بہت ہی محتاط قدم اٹھائے۔ اشتراکی انقلاب کے فوراً بعد دسمبر ۱۹۱۷ء میں عوامی نمائندوں کی کونسل نے روس اور مشرقی دنیا کے مسلمانوں کے نام لینن کے اپنے دستخطوں سے درجِ ذیل اپیل شائع کی:-

"رُوس کے مسلمانو! وولگا اور کریمیا کے تاتاریو! سائبیریا اور ترکمان کے کرغیز اور سارتو! اور ماوراء قفقاز کے ترکو اور تاتاریو! اور کوہستانی نوجوانو! تمہاری مساجد کو غاصب زار نے منہدم کر دیا تھا۔ تمہارے اعتقادات اور تمہاری مذہبی رسومات میں دخل اندازی کی تھی آج

سے تم سب آزاد ہو۔ تمہارا ایمان، تمہاری روایات، تمہارے قومی اور معاشرتی ادارے سب آزاد اور ناقابلِ دخل اندازی ہیں۔ اپنی قومی زندگی کو جس طرح چاہو اپنی مرضی کے مطابق تشکیل دو۔ یہ تمہارا حق ہے۔ اور ہمارے پرچم دنیا بھر کے غلاموں کی آزادی کے ضامن ہیں۔"

اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ۹ دسمبر ۱۹۱۷ء کو حکومت نے "مصحفِ عثمانی" (جسے زار نے سمرقند سے چرا کر سینٹ پیٹرز برگ، جس کو اب لینن گراڈ کہتے ہیں، کی لائبریری میں رکھا ہوا تھا) روسی مسلمانوں کی کانگرس کو پیش کر دیا۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کو اپنے علاقوں میں سول عدالتوں کے ساتھ ساتھ شرعی عدالتیں قائم کرنے کی اجازت بھی دے دی۔ یہ مراعات درحقیقت چالبازیاں تھیں جن کا مقصد اشتراکیت کے اصل عزائم کو چھپانا تھا۔

۱۹۲۲ء میں انہوں نے "ملحد" نامی ایک مجلہ جاری کیا۔ ۱۹۲۵ء میں ملاحدہ کی ایک انجمن قائم کی گئی اور اس طرح بڑے خفیہ طریقے سے اسلام کے خلاف مہم کا آغاز کیا گیا۔ مسلم علاقوں کے اخبارات اور رسائل میں ایک بندھے منصوبے کے تحت خلافِ اسلام مضامین طبع کیے جانے لگے۔ تاہم اس پورے دور میں روسی سوشلسٹوں نے اسلام کے خلاف بہت محتاط رویہ اختیار کیے رکھا۔

بالشویک عہدِ حکومت میں اسلام کو جو ابتدائی مراعات دی گئیں اُن کی وجہ یہ تھی کہ ترکستان، کاکیشیا اور وولگا یورال کے علاقوں میں قومی آزادی کی جدوجہد میں مسلمانوں نے بھرپور حصہ لیا تھا۔ جونہی سوویٹ روس نے مسلمانوں پر تسلط قائم کر لیا، تو اسلام کے متعلق ان کے طرزِ عمل میں بنیادی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اب جو پالیسی اختیار کی گئی وہ مذہب اور خصوصاً اسلام کے سراسر خلاف اور معاندانہ تھی۔ ۱۹۲۹ء میں ملاحدہ کی انجمن نے نہایت جارح طرزِ عمل اختیار کیا۔ مساجد کی ساری جائدادیں ضبط کر لی گئیں۔ مسلم مدارس بند کر دیئے گئے، اسلامی عدالتیں ختم ہو گئیں۔ اور شریعت پر عمل روک دیا گیا۔ بالفاظِ دیگر ہر سمت سے اسلام پر یورشیں ہونے لگیں۔ اکیلے ترکستان میں چودہ ہزار مساجد پر تالے ڈال دیئے گئے۔ وولگا یورال کے علاقے میں مسدود مساجد کی تعداد سات ہزار اور کاکیشیا میں چار ہزار تھی۔ کریمیا میں ایک ہزار مساجد منہدم کی گئیں۔ یہاں تک کہ سارے علاقے میں ایک مسجد بھی ایسی باقی نہ رہی جس میں آزادی کے ساتھ عبادت کی جا سکتی ہو۔ مساجد کی کثیر تعداد مسمار کر دی گئی، اور جو باقی بچیں انہیں کلبوں، تفریح گاہوں اور گوداموں میں تبدیل کر دیا گیا۔ مسلمانوں کے ہزاروں ائمہ پر انقلاب دشمنی، رجعت پسندی

اور قوم پرستی کے الزامات لگائے گئے اور پھر ان بے بنیاد الزامات کی آڑ لے کر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ حج بیت اللہ کی حکماً ممانعت کر دی گئی۔ بیسیوں خلافِ اسلام کتابیں، پمفلٹ اور سینکڑوں مقالات طبع کرا کے عوام میں تقسیم کیے گئے۔

اس تشدد آمیز پالیسی پر ۱۹۴۱ء تک عمل درآمد ہوتا رہا۔ اسلام کو دبانے کی ساری کوششوں کے باوجود سوویٹ قوتیں مسلم اقوام پر پوری طرح قابو پانے میں ناکام رہیں۔ مسلمانوں نے اپنے دینی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے نئے طریقے نکال لیے۔ ایک عالم نے اس دور کے متعلق لکھا ہے کہ:

"اسلام کو زیر زمین جانا پڑا۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ مسلمانوں کی اسلام سے محبت میں کوئی کمی واقع ہو گئی بلکہ اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سوویت حکومت نے مذہبی فرائض ادا کرنے کی راہ میں کس قدر مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ یہ حالات روسی مسلمانوں کو مجبور کر رہے ہیں کہ اپنے مذہبی احساسات کا اظہار نہ ہونے دیں بلکہ مذہبی فرائض کی ادائیگی کو اپنے خاندان اور مخصوص حلقوں تک محدود رکھیں۔ کیونکہ یہ حلقے حکام کی دسترس سے قدرے باہر تھے۔"

وسیع پیمانے پر مذہبی زندگی کا زیر زمین وجود ایک ایسی حکومت کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے جو پوری زندگی پر حاوی ہونے کی آرزومند ہو۔ ۱۹۴۱ء میں جب ہٹلر نے روس پر حملہ کیا تو اس کا نتیجہ سامنے آگیا۔ مذہبی پیروکاروں کے لیے اس حکومت کے حفظ و بقا میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ لاکھوں افراد دشمن کے طرفدار ہو گئے اور مسلمانوں کو سزا دینے کے لیے روسی حکمرانوں کو یہ ایک نیا بہانہ مل گیا۔ ۱۹۴۳ء کے اواخر سے ۱۹۴۴ء کے اوائل تک چیچن، انگوش، کراچائی بلغار اور ایسے ہی شمالی کاکیشیا کے دوسرے مسلمان اور کریمیا کے تاتار، قتل عام اور نسل کشی کے بھیانک مناظر سے دوچار ہوئے اور انہیں ملک بدر ہونا پڑا۔ مگر اس کے ساتھ ہی سٹالن کو اسلام اور دوسرے مذاہب کے بارے میں اپنا ظاہری رویہ تبدیل کرنا پڑا۔ ۸ ستمبر ۱۹۴۲ء کو سوویٹ حکومت نے سرکاری طور پر اعلان کیا کہ اس نے اپنی مذہبی پالیسی تبدیل کر لی ہے اور نتیجۃً اشتراکی پارٹی کا مذہب سے متعلق معاندانہ پروپیگنڈا ختم کر دیا گیا۔ جنگ عظیم دوم کے بعد روس میں چار مذہبی ادارے قائم کر دیے گئے۔ تاشقند کا ادارہ وسطی ایشیا اور قزاقستان کے لیے، یوفا کا ادارہ آر ایس ایف ایس آر کے لیے بوائی نکس کا ادارہ شمالی قفقاز کے لیے اور باکو کا ادارہ ماوراء القفقاز کے لیے قائم ہوا۔ ہر ادارے کا

ڈائریکٹر ایک مفتی کو مقرر کیا گیا جو مذہبی کونسل کی زیرِ نگرانی کام کرتا تھا۔ یہ مذہبی کونسل اشتراکی روس کی وزارتی کونسل سے منسلک تھی۔ تاشقند اور باکو میں ابتدائی اسلامی سکول بھی جاری کیے گئے اور ایک ثانوی سکول بخارا میں کھولا گیا۔ جنگِ عظیم دوم کے بعد بائیس مسلمانوں کا وفد تیار کیا گیا جو ہر سال سرکاری طور پر حج کے لیے روانہ ہوتا تھا۔

اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران اور اس کے بعد سوویٹ حکومت کی پالیسی میں بظاہر جو لچک پیدا ہوئی وہ حقیقتاً مذہب کے متعلق کسی بنیادی تبدیلی کی مظہر نہ تھی۔ یہ لچک بالکل وقتی تھی۔ سوویٹ دستور میں جو پالیسی وضع کی گئی تھی ۱۹۳۵ء تک بدستور نافذ رہی۔ دستور کے پیراگراف ۱۲۴ میں درج ہے کہ "ہر شہری کو ضمیر کی آزادی کی ضمانت دینے کے لیے عبادت گاہوں کو حکومت سے اور تعلیمی اداروں کو عبادت گاہوں سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ مذہبی رسومات پر عمل کرنے یا مذہب کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا ہر شہری کو پورا حق حاصل ہے اور اس حق کی ضمانت دی جاتی ہے۔" اس پیراگراف میں عوام کو دو حق دیئے گئے ہیں۔ عبادت کا حق اور خلافِ مذہب پروپیگنڈے کا حق۔ ظاہر ہے یہ دونوں حقوق برابر نہیں ہیں۔ ایک طرف عوام کو اجازت ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق جس مذہبی گروہ کے ساتھ چاہیں تعلق رکھیں اور کسی مندر، گرجا یا مسجد میں جا کر عبادت کر سکیں، دوسری طرف کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ عبادت گاہ سے باہر نکل کر عوام میں اس عقیدہ کی تبلیغ کر سکے۔ المختصر کسی کو بھی حکومت کے نظریۂ حیات پر عوام میں گفتگو کی اجازت نہیں۔ حکومت نے مذہب کے خلاف پروپیگنڈے کے متعلق جو ڈرامائی طرزِ عمل اختیار کیا اس سے ان دونوں حقوق کی عدمِ مساوات کا مظاہرہ ہو گیا۔ حکومت کو ذرائع ابلاغ اور تعلیم پر پورا کنٹرول حاصل ہے۔ ان کے ذریعے جس غیر معمولی طاقت سے ملحدانہ پراپیگنڈا کیا جاتا ہے، اس کا مقابلہ کرنا، یا اس کے اثرات کو زائل کرنا کسی فردِ واحد کے بس سے باہر ہے۔ پھر معاملہ اسی پر ختم نہ ہوا بلکہ حکومت نے ضابطۂ تعزیرات کی دفعہ ۱۲۲ کے پیراگراف نمبر ۴ میں واضح طور پر یہ لکھ دیا کہ ریاست کے تعلیمی اداروں میں نوجوانوں کو مذہب کی تعلیم دینا منع ہے۔ اور اس جرم پر ایک سال یا اس سے کم مدت کے لیے قید کی سزا دی جا سکتی ہے۔

جنگ کے بعد سوویٹ حکومت کی دو رخی پالیسی بالکل نمایاں ہو گئی۔ ایک طرف تو مسلمانوں کے مذہبی اداروں اور تین سکولوں کو کام کرنے کی اجازت دی گئی۔ منتخب افراد کو حج کے لیے مکہ روانہ

کیا جانے لگا اور شہروں میں چند ایک مساجد بھی واگزار کر دی گئیں۔ لیکن دوسری طرف ۱۹۴۶ء میں نظریۂ حیات کے مسئلہ پر اشتراکی پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے فیصلوں کے بعد مذہب کے خلاف پروپیگنڈے کی مہم کو ایک تحریک کی صورت دے دی گئی۔ یہ طرزِ عمل مسلسل جاری رہا۔ ۱۹۴۷ء میں انجمن ملاحدہ کی جگہ ایک کل جماعتی سوسائٹی ترتیب دی گئی جس کا مقصد سیاسی اور سائنسی علوم کی ترویج تھا۔ اس سوسائٹی نے جو ایک حکومتی ادارہ ہے روس کی سائنس اکیڈمی اور دوسرے اداروں کے ساتھ مل کر مذہب کے خلاف مسلسل پروپیگنڈا شروع کر دیا جو آج تک جاری ہے۔ اس سوسائٹی کی سرگرمیوں کو کمیونسٹ پارٹی ترتیب دیتی ہے اور وہی اس کا کنٹرول بھی کرتی ہے۔ اس سوسائٹی کا ایک رکن کلیمووش (L. I. KLIMOVICH) ہے جو ماہرِ علومِ اسلامیہ کہلاتا ہے (یہ پیدائشی مسلمان ہے۔ اس کا نام کلیم صاف بتا رہا ہے کہ مسلمان ہے۔ اسی طرح سے ابراہیم کو ابراہیموف، اور اسماعیل کو اسمٰعیلوف قرار دے دیا جاتا ہے)۔ یہ شخص دعویٰ کرتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم (نعوذ باللہ) ایک ایسی فرضی شخصیت ہیں جو اس دنیا میں کبھی مبعوث نہ ہوئے۔ وہ کہتا ہے کہ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم (معاذ اللہ) ایک مصنوعی شخصیت ہیں جنہیں آج تک اسلام کے آغاز کی گرہ کشائی کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے ..... اسلام ایشیائی جاگیرداروں کا نظریۂ حیات ہے اور قرآن سرمایہ داروں کی تصنیف ہے جسے سرمایہ داروں کے تسلط کو تحفظ دینے کے لیے گھڑا گیا ہے"۔ مذہب کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈے کی موجودہ شدت اس امر سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ سیاسی اور سائنسی علوم کی ترویج کے لیے وجود میں آنے والی سوسائٹی کے ارکان نے صرف ازبکستان میں گزشتہ دو سالوں کے اندر الحاد کے حق میں ۴۲۰۰ تقاریر کیں۔ ازبکستان میں مذہب کے خلاف پروپیگنڈا کے لیے صرف یہی ایک سوسائٹی نہیں بلکہ بہت سے اور ادارے اور تنظیمیں اس کام میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ ماہنامہ ازبکستان کومونسٹی کے جون ۱۹۷۰ء کے شمارے کی اطلاع کے مطابق صرف ازبک سوویٹ سوشلسٹ ری پبلک میں ۲۱۸ ملحدانہ پروپیگنڈا کے تعلیمی ادارے موجود ہیں جن میں تین ہزار سے زیادہ طلبہ زیرِ تعلیم ہیں۔ علاوہ ازیں تاشقند میں ایک ایسا تربیتی ادارہ بھی ہے جس میں ملحد استادوں کو ٹریننگ دی جاتی ہے اور ازبکستان میں انتیس ۲۹ ایسی عوامی یونیورسٹیاں بھی کام کر رہی ہیں۔ مزید برآں اس رسالے کے مطابق ایک ہزار سے زائد افراد کمیونسٹ پارٹی کے تعلیمی اداروں سے ملحدانہ پروپیگنڈا کی خصوصی مہارت حاصل کر چکے ہیں۔ تاشقند اور تاجکستان ایسے

علاقوں میں واقع حکومتی یونیورسٹیوں میں ملحدانہ پروپیگنڈا کے ماہرین تیار کرنے کے لیے علیحدہ تنظیمی شعبے موجود ہیں۔ ان شعبوں میں اسلام کے خلاف جدوجہد کے لیے خاص دستے تیار کیے جاتے ہیں۔ ملحدانہ عجائب گھروں اور رہائش گاہوں کے ذریعے اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ موجودہ حکومت کی نگاہ میں اسلام کے خلاف یہ پروپیگنڈا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اشتراکی طرز حکومت کے نقطۂ نگاہ سے مذہب ان کی راہ کا سب سے بڑا سنگِ گراں ہے۔ "ازبکستان کمیونسٹ" میں درج ہے کہ ہمارے زمانے میں مذہب ایسے نظریہ کا نام ہے جس کا مقصد صرف مارکسزم اور لینن ازم کی مخالفت ہے۔ لہٰذا مذہب کے خلاف جدوجہد کرنے کی خاطر اور اس سے نفرت کے اظہار کے لیے سوویٹ حکومت فنون و ادب کے ذرائع بھی استعمال کرتی ہے۔ اس وقت تاشقند میں اسلام کے خلاف ۵ ڈرامے دکھائے جا رہے ہیں سکولوں کے اساتذہ کے لیے ایسے مقالے شائع کیے جا رہے ہیں جن سے انہیں ادب کو مذہب کے خلاف استعمال کرنے کا ڈھنگ سکھایا جاتا ہے۔ (باقی)

مسئلہ ملکیّت

(از جناب ریاض الحسن صاحب نوری)

ذرائع رزق کی ملکیّت

یہ معلوم ہے کہ قدیم زمانے میں عرب اور اس کے قرب وجوار کے علاقوں میں اونٹ اور بھیڑ بکریاں رزق حاصل کرنے کا اہم ذریعہ تھیں۔ اگر قرآن کی رُو سے کوئی شخص رزق کے ذرائع کا مالک نہیں ہو سکتا تو بھیڑ بکری اونٹ گھوڑوں وغیرہ کا بھی مالک نہیں ہو سکتا۔ مگر قرآن اس نظریے کو صاف الفاظ میں جھٹلاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا یَاْكُلُوْنَ۔ وَلَهُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ اَفَلَا یَشْكُرُوْنَ۔

(ترجمہ: کیا ان لوگوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہم نے ان کے (نفع کے) لیے اپنے ہاتھوں کی ساختہ چیزوں سے مویشی پیدا کیے۔ پھر یہ لوگ ان کے مالک ہو گئے ہیں اور ہم نے ان مویشیوں کو ان کا تابع بنا دیا ہے، سو ان میں سے بعض تو ان کی سواریاں ہیں اور بعض کو وہ کھاتے ہیں اور ان میں لوگوں کے لیے اور بھی نفع کی چیزیں ہیں اور پینے کی چیزیں بھی ہیں (یعنی دُودھ) سو کیا یہ لوگ شکر نہیں کرتے)۔ (یٰسین: ۷۱-۷۳)

مذکورۂ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ نے مویشیوں پر انسانوں کی ذاتی ملکیت کو بطورِ احسان ذکر کیا ہے۔ اس سے بڑھ کر ملکیت کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک انسان جانور کا مالک بنتا ہے اور اس کو ذبح کر کے کھا جاتا ہے۔ مزید مویشی لوگوں کی ذاتی ملکیت بن کر ان کے رزق کا ذریعہ بنتے ہیں اور اگر ان کی تعداد زیادہ ہو تو شریعت کی رُو سے حکومت کو زکوٰۃ دینی پڑتی ہے۔ اگر ذاتی ملکیت جائز نہیں تو زکوٰۃ کیسے وصول کی جاتی۔ کیا حضرت ابوبکرؓ قرآن کو نہیں سمجھتے تھے کہ انہوں نے جانوروں کی زکوٰۃ وصول کی۔ اس میں شک نہیں کہ کُل کائنات کا جس میں انسان بھی شامل ہیں مالک اللہ ہی ہے لیکن کیا اللہ کی

انسان کو دنیاوی زندگی میں کسی چیز کا مالک بنانے کا حق نہیں رکھتا۔ بعض لوگ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ کا نعرہ لگاتے ہیں اور اس سے فوراً یہ نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں کہ اسلام میں ذاتی ملکیت کا تصور ناجائز ہے مگر آیت کا اگلا حصہ بیان نہیں کرتے۔ اس کو ساتھ ملانے سے آیت یوں پوری ہوتی ہے اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ (۷ : ۱۲۸) "تحقیق زمین اللہ تعالیٰ کی ہے جس کو چاہیں مالک بنا دیں اپنے بندوں میں سے اور آخر کار کامیابی انہی کو ہوتی ہے جو خدا سے ڈرتے ہیں"۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے وارث کا ترجمہ مالک کیا ہے۔ اگر کسی کا خیال ہو کہ وراثت کا مطلب ملکیت نہیں ہو سکتا تو سنیے خدا نے خود یہ لفظ اپنے لیے استعمال کیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَیْهَا وَاِلَیْنَا یُرْجَعُوْنَ (۱۹ : ۴۰) "تمام زمین اور زمین کے رہنے والوں کے ہم ہی وارث (مالک) رہ جائیں گے"۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے وارث کا لفظ خود اپنے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ بخاری اور دیگر محدثین و مؤرخین مثلاً بلاذری نے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جو کوئی قرض چھوڑ کر مرے گا تو حکومت اس کا قرض ادا کرے گی اور جو وراثت چھوڑ کر مرے گا تو وہ اس کے وارثوں کا حصہ ہوگا۔ اگر ذاتی ملکیت کی نفی کرنے والوں کے موقف کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین جو وراثت کے متعلق عدالتی فیصلے کرتے رہے وہ نعوذ باللہ سب غلط قرار پاتے ہیں۔

نبوت کے زمانے میں سکے بہت کم ہوتے تھے۔ لوگوں کا مال و دولت سب جائیداد مویشی یا اجناس کی صورت میں ہوتا۔ مقدمے بہت کم آتے جو آتے وہ زیادہ تر وراثت کی تقسیم سے متعلق ہوتے تھے جن کے فیصلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے تھے۔ جائیداد کی تقسیم کے عام رواج کی وجہ ہی تھی کہ حضورؐ کے وصال کے بعد جیسا کہ بخاری میں موجود ہے، حضرت فاطمہؓ، ازواجِ مطہرات اور حضرت عباسؓ دربارِ خلافت میں خیبر اور باغِ فدک کی زمین کی تقسیم وراثت کے طریق پر کرانے کے لیے مقدمہ لے کر پہنچے۔ یہ معاملہ چونکہ تفصیل طلب ہے اس لیے اس پر ہم نے الگ بحث کی ہے۔ لیکن تمام شیعہ اور سُنّی محدثین اور مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ مقدمہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آیا بلکہ بعد میں بھی اس کا سلسلہ چلتا رہا۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ نہیں کہا کہ قرآن کی رُو سے زمین یا جائیداد میں وراثت نہیں چلتی۔ زمین تو اللہ کی ہے۔ اگر حضورؐ کے زمانے میں زمین جائیداد وارثوں میں تقسیم نہ ہوا کرتی تو یہ سب

لوگ اس مقدمے کو لے کر ہرگز نہ جاتے۔ یہ بات تو کہی گئی کہ نبیؐ جو چھوڑتا ہے اس پر خاص وقف کے طریقے سے عمل ہوتا ہے مگر کسی صحابی نے بھی یہ نہیں کہا کہ یہ مقدمہ ہی کیوں قائم ہوا۔ زمین تو کسی غیر نبی کی بھی وراثت میں تقسیم نہیں ہوتی۔ کیا یہ سب صحابہ (نعوذ باللہ) قرآن کو نہیں سمجھتے تھے۔ کیا حضورؐ کے چچا، آپکی صاحبزادیؓ، امہات المومنین سب قرآن سے نعوذ باللہ نابلد تھے۔ اگر ساری تاریخ اور ساری احادیث کی کتابوں میں کہیں ملکیت و وراثت کا ذکر نہ ہوتا، صرف باغ فدک کا واقعہ ہی ہوتا تب بھی یہ اکیلا مقدمہ ہی ذاتی ملکیت اور تقسیم وراثت کے رواج اور شرعی قانون کو ثابت کرنے کے لیے کافی تھا۔

قرآن سے ذاتی ملکیت کا ثبوت سورۂ کہف میں صاف طور پر اللہ تعالیٰ نے زمین، باغ کھیتی کی ذاتی ملکیت کا ذکر کیا ہے:

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ـ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ أُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ ... وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ ... وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ ...... (۱۸: ۳۲ تا ۴۴)

ترجمہ: اور آپ ان لوگوں سے دو شخصوں کا حال بیان کیجیے۔ ان دو شخصوں میں سے ایک کو ہم نے دو باغ انگور کے دے رکھے تھے اور ان دونوں (باغوں کا) کھجور کے درختوں سے احاطہ بنا رکھا تھا اور ان دونوں کے درمیان کھیتی بھی لگا رکھی تھی (اور) دونوں باغ اپنا پورا پھل دیتے تھے اور کسی کے پھل میں ذرا بھی کمی نہ رہتی تھی۔ اور ان دونوں کے درمیان نہر چلا رکھی تھی اور اس شخص کے پاس اور بھی پھل تھے۔ سو (ایک بار) اپنے اس (دوسرے) ملاقاتی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے کرتے کہنے لگا کہ میں تجھ سے مال میں بھی زیادہ ہوں اور میری عزت بھی زیادہ ہے۔ میرا مجمع بھی زبردست ہے۔ اور داخل ہوا اپنے باغ میں اور وہ ظلم کرنے والا تھا اپنی جان پر (اور) کہنے لگا کہ میرا خیال نہیں ہے کہ یہ باغ کبھی بھی برباد ہو اور میں قیامت کو نہیں خیال کرتا کہ آوے گی اور اگر میں اپنے رب کے پاس پہنچایا گیا تو ضرور اس باغ سے بہت زیادہ اچھی جگہ مجھ کو ملے گی۔ اس سے اس کے ملاقاتی نے (جو کہ دیندار غریب تھا) جواب کے طور پر کہا کہ کیا تو اس ذات (پاک) کے ساتھ کفر کرتا ہے جس نے تجھ کو (اوّل) مٹی سے پیدا کیا پھر نطفہ سے پھر تجھ کو صحیح

سالم آدمی بنایا۔ لیکن میں تو یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ وہ یعنی اللہ تعالیٰ میرا رب (حقیقی) ہے اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھیراتا۔ اور تو جس وقت اپنے باغ میں پہنچا تھا تو تو نے یوں کیوں نہ کہا کہ جو اللہ کو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے اور بدون خدا کی مدد کے (کسی میں) کوئی قوت نہیں۔ اگر تو مجھ کو مال اور اولاد میں کمتر دیکھتا ہے تو مجھ کو وہ وقت نزدیک معلوم ہوتا ہے کہ میرا رب مجھ کو تیرے باغ سے اچھا باغ دے دے اور اس (تیرے باغ) پر کوئی تقدیری آفت آسمان سے بھیج دے جس سے وہ باغ دفعۃً ایک صاف میدان ہو کر رہ جائے۔ اس سے اس کا پانی بھی اندر (زمین میں) اتر کر خشک ہو جائے پھر تو اس کی طلب بھی نہ کر سکے اور اس شخص کے سامانِ تمول کو آفت نے آگھیرا۔ پھر اس نے جو کچھ باغ پر خرچ کیا تھا اس پر ہاتھ ملتا رہ گیا اور وہ باغ اپنی ٹٹیوں پر گرا ہوا پڑا تھا۔ اور کہنے لگا کیا خوب ہوتا کہ میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیراتا۔ اور اس کے پاس کوئی ایسا مجمع نہ ہوا کہ خدا کے سوا اس کی مدد کرتا اور نہ وہ خود (ہم سے) بدلہ لے سکا۔ اس جگہ حکم چلانا واسطے اللہ کے ثابت ہے۔ وہ بہتر ہے ثواب دینے میں اور بہتر ہے انجام لانے میں"۔

پس مذکورہ بالا آیات سے گھوڑے، اونٹ، مویشیوں، زمین، باغ، کھیتی وغیرہ جیسے ذرائع رزق میں ذاتی ملکیت قرآن سے ثابت ہو گئی۔

مطبوعات

المنقذ من الضلال (عربی ایڈیشن) تالیف: امام ابوحامد محمد الغزالی۔ شائع کردہ: محکمہ اوقاف پنجاب
قیمت تین روپے پچاس پیسے۔

"المنقذ من الضلال" امام غزالیؒ کی نہایت مشہور اور اہم تالیف ہے۔ امام موصوف کی فکری زندگی کا آغاز فلسفہ و کلام اور باطنیہ کے افکار کے مطالعہ سے ہوا۔ ان افکار نے اُن کے ذہن کو تو ایک حد تک مطمئن رکھا لیکن ان کی رُوح غیر مطمئن رہی۔ اور چھ ماہ کا عرصہ تو انہوں نے شدید نفسیاتی کشمکش میں گزارا۔ ایک طرف انہیں دنیوی شان و شوکت حاصل تھی اور دوسری طرف اُن کا دل یہ گواہی دے رہا تھا کہ یہ ریاکارانہ زندگی آخرت میں رُوسیاہی کا باعث ہوگی۔ رُوح کی اس تشنگی اور بیقراری سے بے تاب ہو کر امام موصوف نے دنیاوی جاہ و جلال اور بغداد کی رونق افروز علمی مجلسوں کو تج دیا اور معرفتِ حق اور جوہرِ حقیقت کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ اور آخر کار معرفتِ حق اور روحانی جلا سے ہمکنار ہوئے۔ "المنقذ من الضلال" اسی جستجو کا حاصل ہے۔ شرعی اور عقلی علوم سے انہیں جو کچھ حاصل ہوا اس کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں کہ انہیں تین چیزیں حاصل ہو چکی تھیں: اللہ تعالیٰ پر پختہ ایمان، نبوّت پر پختہ ایمان اور آخرت پر پختہ ایمان۔ لیکن ان بنیادی عقائد پر کامل یقین کے بعد انہیں اب اس چیز کی تلاش تھی جو ان عقائد کو ان کی زندگی پر اس درجہ غالب کر دے کہ زندگی کی راحت و مسرت کا اصل معیار یہ عقائد ہوں نہ کہ دوسرے پیمانے۔ یہ چیز جسے معرفتِ حق، محبّتِ الٰہی اور تعلق باللہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کتابوں اور مباحثوں سے نہ مل سکتی تھی، بلکہ اس کا تعلق ذوق اور سلوک سے تھا۔ ایسا ذوق اور سلوک جو قلب و روح کو جلا بخشے۔ اور انہیں عشقِ الٰہی سے سیراب کرے۔ اس ساری داستان کو موصوف نے "المنقذ من الضلال" میں بیان کیا ہے۔ یہ کتاب آج تک اہلِ ذوق اور راہ سپارانِ جادۂ حق کے لیے مشعلِ ہدایت بنی رہی ہے۔

المنقذ کا عرب ممالک میں نہایت اعلیٰ اور معیاری عربی اڈیشن چھپ چکا ہے۔ مگر پاکستان کے اہلِ علم حضرات کو شاید وہ آسانی سے فراہم نہ ہو سکتا ہو۔ محکمۂ اوقاف نے پاکستان میں طبع کرا کر اس خیر کو عام کرنے کا قابلِ قدر کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ محکمۂ اوقاف کے جناب ڈاکٹر رشید جالندھری صاحب نے تصحیح کا کام سرانجام دیا ہے۔ اور جگہ جگہ حواشی بھی لکھے ہیں۔ ایک مختصر مقدمہ بھی تحریر کیا ہے جس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ امام غزالیؒ نے المنقذ میں جو کچھ بیان کیا ہے اس میں اور سینٹ اوغسطین کے اعترافات اور ٹالسٹائی کے افکار میں بعض پہلوؤں سے مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس مختصر سے مقدمے میں ڈاکٹر صاحب کو یہ بحث چھیڑ دینا قاری کو الجھن میں ڈال سکتا ہے۔ اگر امام غزالیؒ کا مذکورہ دونوں شخصیتوں سے کسی پہلو سے موازنہ درکار تھا تو اس پر بھرپور بحث کی جانی چاہیے تھی۔

حدیثِ رسولؐ کا تشریعی مقام ۔ تالیف: ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم۔ ترجمہ: پروفیسر غلام احمد حریری۔
ناشر: ملک برادرز کارخانہ بازار لائل پور۔ صفحات ۴۰۰۔ قیمت ۱۵/- روپے۔ کتابت، طباعت آفسٹ

حدیثِ رسولؐ کا تشریعی مقام، ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم کی عربی کتاب "السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی" کا اردو ترجمہ ہے۔ موصوف دنیائے اسلام کی اُن معدودے چند شخصیات میں سے ایک ہیں جنہیں دورِ جدید میں مخالفینِ اسلام ۔ مستشرقین اور ان کے مقلدین ۔ کی مذموم مساعی کا سدّباب کرنے کی سعادت ملی۔ یہ حقیقت ہے کہ مشرق و مغرب کے تمام باطل پرست اور اباحیت پسند اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ اسلام کی تعلیمات کو مسخ کرنے کی کوئی صورت اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ ارشاداتِ رسول کو بے اصل یا کم از کم مشتبہ نہ بنا ڈالا جائے۔ چنانچہ اس کارِ تشکیک کو انجام دینے کے لیے کبھی احادیث کا انکار یہ کہہ کر کیا گیا کہ یہ خلافِ عقل ہیں کبھی انہیں ترقی کی راہ کا روڑا سمجھ کر مسترد کر دیا گیا۔ اور کبھی تحقیق کے نام پر تحریف و تنسیخ کا کھیل کھیلا گیا۔ اس کام میں نام نہاد مسلم مفکرین علانیہ اور یہودی مستشرقین بھی پیش پیش ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں سباعی مرحوم نے انہیں مستشرقین اور ان کے متبعین کی خوب خبر لی ہے۔ اور حدیثِ رسولؐ کا کامیابی کے ساتھ دفاع کیا ہے۔ کتاب کے تین ابواب ہیں۔ پہلے باب میں سنت کا معنیٰ و مفہوم، وضعِ حدیث کے اسباب و محرکات اور اس کی تردید و مذمت میں علماء کی مساعی کی

تفصیل ملتی ہے۔ دوسرے باب میں حدیثِ نبوی پر قدیم و جدید معترضین کے اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے اور تحقیق کے خوب جوہر دکھائے گئے ہیں۔ کتاب کا یہ حصہ سب سے زیادہ جاندار ہے اور تقریباً سوا تین سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ تیسرے باب میں قرآن و حدیث کا باہمی تعلق اور احکام قرآن و سنت کے نسخ سے متعلق بعض مباحث بالاختصار ملتے ہیں۔ آخر میں ائمہ اربعہ اور صحاح ستہ کے مؤلفین کے مختصر حالاتِ زندگی درج کیے گئے ہیں۔

کتاب کے اوّل و آخر میں کہیں بھی فصول و ابواب کی صفحہ وار فہرست نہیں دی گئی جس سے اخذ و استفادہ میں دشواری پیش آتی ہے۔

حدیثِ رسولؐ کا تشریعی مقام، بلاشبہ ان چند بہترین کتب میں سے ایک ہے جن میں حُجّیتِ حدیث کا اثبات کرتے ہوئے مخالف حلقوں کے اعتراضات کا علمی جواب دیا گیا ہے۔ اور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ تالیف اسلامی لٹریچر میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔ جناب غلام احمد حریری کا اردو ترجمہ نہایت شگفتہ اور رواں ہے۔ اس پیش کش پر مصنف، مترجم اور ناشر سبھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

(بقیہ اشارات)

اسے ہماری بدقسمتی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہم جن نمائندوں کو اس غرض کے لیے منتخب کرتے ہیں کہ وہ قرار دادِ مقاصد کی روشنی میں ملک اور قوم کو آگے بڑھائیں وہ اس متعین نصب العین کو نظر انداز کر کے بعض ایسے مقاصد کی تکمیل کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیتے ہیں جو اس نصب العین کی بالکل ضد ہیں۔ کیا اس طرزِ عمل کو کوئی باضمیر شخص پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ سکتا ہے؟ تمام وہ ممالک جن میں جمہوری نظام رائج ہے وہاں عوامی نمائندے انتخابات کے ذریعے بدلتے رہتے ہیں لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی انتخاب میں کامیاب ہونے والے نمائندوں نے ان تصورات ہی پر تیشہ زنی کا عمل شروع کر دیا ہو جو ان ممالک اور قوموں کے

لیے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ نمائندوں کا کام عوام کی نمائندگی کرنا ہے۔ انہیں یہ حق کسی صورت بھی نہیں پہنچتا کہ وہ عوامی آرزوؤں اور تمناؤں کو بروئے کار لانے کے بجائے ان آرزوؤں اور تمناؤں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے لگیں۔

ہم موجودہ ارکانِ اسمبلی کو اُن کی ذمّہ داریوں کا احساس دلاتے ہوئے بڑے واضح الفاظ میں یہ کہتے ہیں کہ وہ اپنی حدُودِ کار کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اس ضمن میں کوئی ایسا اقدام نہ کریں جو اُن کی آئینی حدُود سے متجاوز ہو۔ وہ جس اسمبلی کے ارکان ہونے کے دعویدار ہیں اس کی ہیئتِ ترکیبی ہی محلِ نظر ہے۔ قومی اسمبلی کی اکثریت مشرقی پاکستان سے تعلق رکھتی ہے جسے ابھی تک آئینی اعتبار سے پاکستان کا حصّہ ہی تسلیم کیا جارہا ہے۔ مشرقی پاکستان کے ارکانِ اسمبلی کی تعداد ۱۶۸ ہے جبکہ مغربی پاکستان میں یہ تعداد ۱۴۴ ہے۔ اس صورت میں اگر ہم ۱۶۸ ارکان کے پاس کردہ دستور کو مسترد کرنے کے مجاز ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ۱۴۴ ارکان کے پاس کردہ مسودۂ دستور کو مسترد نہ کر سکیں لیکن ۱۴۴ ممبروں کے اس حق کو تسلیم کرنے کے بعد کہ وہ بنیادی تبدیلیوں کا فیصلہ کر سکتے ہیں، ہم ۱۶۸ کے اس حق کو ماننے سے کیسے انکار کر سکتے ہیں کہ وہ پاکستان ہی کے ٹکڑے کر ڈالنے کے مجاز ہیں؟

پھر اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ موجودہ اسمبلی لیگل فریم ورک آرڈر (قانونی ڈھانچے) کے تحت بعض ایسی بنیادی شرائط کے ساتھ معرضِ وجود میں آئی ہے جن کی پابندی اس پر ہر حال میں لازم ہے، اور اِن شرائط کو توڑنا تو کیا وہ اُن کے خلاف سوچنے کی بھی مجاز نہیں، کیونکہ تمام پارٹیوں نے اس لیگل فریم ورک آرڈر کے تحت انتخابات میں حصّہ لیا تھا اور وہ ووٹروں اور ان پارٹیوں کے درمیان ایک معاہدے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اسمبلی اس قانونی ڈھانچے کی رُو سے دو باتوں کی پابند ہے۔ ایک یہ کہ وہ چار ماہ کے اندر تدوینِ دستور کا کام مکمل کرے اور دوسرے یہ کہ وہ دستور اسلام کے عین مطابق ہو۔ اب اگر یہ اسمبلی ان دو بنیادی شرائط کو توڑتی ہے تو وہ خود بخود کالعدم قرار پاتی ہے۔ بعض لوگ اس موقف کے بارے میں یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ چونکہ عدالتِ عظمیٰ کے فیصلے کے مطابق سابق صدر یحییٰ کو غاصب قرار دیا گیا ہے اس لیے اس کا قانونی ڈھانچہ بھی بیکار بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر

اس اعتراض کو صحیح مان لیا جائے تو پھر موجودہ اسمبلی کا وجود ہی باقی نہیں رہتا کیونکہ جس انتخاب کے نتیجے میں موجودہ ارکانِ اسمبلی منتخب ہوئے ہیں وہ بھی اس غاصب کے تاریک عہد کا کارنامہ ہے۔

ہم نے عبوری آئین کی تدوین کے وقت ارکانِ اسمبلی کی خدمت میں یہ گذارشات پیش کرنے سے اس وجہ سے احتراز کیا تھا کہ ہم یہ سمجھتے تھے کہ اس اسمبلی اور اس کے ارکان کو اپنی حدودِ کار اور اپنی ملّی ذمہ داریوں کا اچھی طرح احساس ہوگا لیکن اِس آئین کے منظرِ عام پر آنے کے بعد ہمارے اس اعتماد کو خاصا دھچکا لگا اور یہ حقیقت سامنے آئی کہ اس اسمبلی کے بعض "من چلے" ارکان نشۂ اقتدار میں اس حد تک بہک گئے ہیں کہ وہ عوام کی نمائندگی کا مقدس فرض ادا کرنے کے بجائے اپنی ذاتی آراء کو قوت کے زور پر اس ملک میں مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ جو عبوری آئین سامنے آیا ہے اُسے دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی ہے۔ اس میں نہ تو اسلام کو دستور کی بنیاد اور اساس قرار دیا گیا ہے اور نہ ان اصولوں کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے جو قانونی ڈھانچے میں طے کیے گئے تھے، بلکہ عوام کی گردنوں میں ایک ایسے آئین کا قلادہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے جس کا تانا بانا آمریت سے تیار کیا گیا ہے۔ مرکز میں صدارتی نظام اور وہ بھی بڑے وسیع اختیارات کے ساتھ، اور صوبوں میں پارلیمانی نظام غیر معمولی حدود و قیود کے ساتھ۔ اگر اس ملک میں آمریت کو مسلط کرنے کا پیش خیمہ نہیں تو اور کیا ہے؟

ان حالات میں ہم ارکانِ اسمبلی سے اور خصوصاً ان لوگوں سے جو اقتدار سے وابستہ ہیں بڑی دلسوزی سے یہ عرض کرتے ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داریوں اور اپنے حدودِ کار کا اچھی طرح احساس کریں اور ملک کے لیے کسی ایسے دستور کی تدوین کریں جو اسلامی نظامِ حیات کا ہر لحاظ سے مظہر ہو تاکہ اس ملک میں ان مقدس آرزوؤں کی تکمیل ہو سکے جنہیں پورا کرنے کے لیے اس برِ اعظم کے مسلمانوں کو ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی مرتبہ آگ و خون کے سمندر سے گزرنا پڑا ہے۔ اگر خدانخواستہ انہوں نے اپنے اس فرض میں کوتاہی کی یا اپنے حدود سے تجاوز کرتے ہوئے قوم پر کسی غیر اسلامی اور غیر جمہوری آئین کو ٹھونسنے کی کوشش کی تو یہ قرار دادِ مقاصد سے غداری ہوگی جس کے بعد اسمبلی کے قائم رہنے کا کوئی جواز باقی نہ رہے گا۔

ہماری تازہ مطبوعات

ملّتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ

(حصّہ سوم)

تالیف:- ثروت صولت

- ملت اسلامیہ کے دورِ زوال کی دردناک داستان۔
- اپنوں کی ریشہ دوانیوں اور غیروں کی چیرہ دستیوں کی رُوداد۔
- پورے عالم اسلام کی حقیقی تصویر۔
- نادر تاریخی نقشے۔ صفحات ۴۸۰
- قیمت -/۱۱ روپے

ترکی ــــ قدیم و جدید

(رُوداد سفر)

تالیف:- خلیل احمد حامدی

- پاکستان کے قابلِ اعتماد حلیف کے متعلق مستند معلومات۔
- ترکی کی اہم شخصیات اور تحریکوں کا تعارف۔
- اس اہم مسلم ملک کی داخلی و خارجی کشمکش کی مفصل رُوداد۔
- نادر تصویروں اور نقشوں سے مزین۔
- قیمت -/۸ روپے

اخوان المسلمون تاریخ ــ دعوت ــ خدمات

مرتبہ:- خلیل احمد حامدی

- دنیائے اسلام کی عظیم اسلامی تحریک پر مستند کتاب۔
- استقامت، قربانی اور عزیمت کی لازوال داستان۔
- اہلِ ایمان کے لیے روشنی کا مینار۔
- اردو میں اس موضوع پر واحد مفصّل اور جامع کتاب

قیمت صرف -/۱۳ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ - ۱۳- ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

فون نمبر ۶۲۵۰۷

ضروری اعلان

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن جلد پنجم کے علاوہ پہلی چاروں جلدیں بھی ہمارے درجِ ذیل ایجنٹ حضرات سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔

۱- اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، شاہ عالم مارکٹ لاہور
۲- مکتبہ تعمیرِ انسانیت، موچی دروازہ گوجر گلی، لاہور
۳- ادارہ بتول اچھرہ، لاہور
۴- مکتبہ الخیر اردو بازار، لاہور
۵- میسرز تاج کمپنی لمیٹڈ، بندر روڈ، کراچی
۶- نورسی پبلیکیشنز، لیاقت آباد، کراچی
۷- میسرز یونائیٹڈ بکسیلرز اینڈ سٹیشنرز اردو بازار کراچی
۸- شیخ سنز، اردو منزل، اردو بازار کراچی
۹- پنجاب نیوز ایجنسی، اردو بازار کراچی
۱۰- نشیر خاں تاجرِ کتب، اڈرام روڈ پاکستان چوک، کراچی
۱۱- مکتبہ تعمیرِ افکارِ اسلامی حکیم ابن سینا روڈ، ناظم آباد کراچی
۱۲- مکتبہ چراغِ راہ، یوسف منزل، ہرموس جی سٹریٹ کراچی
۱۳- مدینہ پبلشنگ کمپنی، بندر روڈ کراچی
۱۴- مکتبہ اسلامی کورٹ روڈ، حیدر آباد، سندھ
۱۵- ہیران بکڈپو، نور محمد ہائی سکول بلڈنگ، حیدر آباد
۱۶- اتحاد بکڈپو، کورٹ روڈ، گاڑی کھاتہ، حیدر آباد
۱۷- رحمان نیوز ایجنسی، شارع فاطمہ جناح، کوئٹہ
۱۸- مکتبہ اسلامی معرفت دفتر جماعت اسلامی جیکب آباد
۱۹- محمد مصاحب علی صاحب امیر جماعت اسلامی نواب شاہ
۲۰- رہنما پبلیکیشنز، والس روڈ، سکھر
۲۱- مکتبہ تعمیرِ ملت، ڈہرکی ضلع سکھر
۲۲- ملت بکڈپو، ریلوے روڈ رحیم یار خاں
۲۳- اقبال بکڈپو، اردو بازار، ہارون آباد
۲۴- مکتبہ احیائے ملت، کپ بازار ملتان
۲۵- کاروان بک سنٹر صدر بازار شاپنگ سنٹر ملتان
۲۶- عزیزیہ کتب خانہ چوک صرافہ بازار ڈیرہ اسماعیل خاں
۲۷- ضیا بکڈپو، بازار شہیداں ہوتی مردان
۲۸- مکتبہ اسلامی بنک روڈ مردان شہر
۲۹- فیض محمد ہری پور ہزارہ
۳۰- شوکت کریانہ سٹور، مانسہرہ، ہزارہ
۳۱- سعید نیوز ایجنسی، رضا شاہ پہلوی روڈ، راولپنڈی فون نمبر ۶۸۲۶۱
۳۲- مکتبہ افکارِ اسلامی بازار تلواڑاں، راولپنڈی کینٹ
۳۳- مکتبہ میسرز دارالادب بکسیلرز اینڈ سٹیشنرز، لیاقت سٹریٹ پشاور
۳۴- مکتبہ اسلامی بنک روڈ، مردان شہر
۳۵- عبدالرحمٰن شاہ خطیب جامع مسجد غزنی خیلاں بنوں شہر
۳۶- فیض احمد، سہیل بکڈپو سرگودھا
۳۷- مکتبہ جوہر فوارہ چوک جوہر آباد، ضلع سرگودھا
۳۸- حکیم محمد اسحاق، ریلوے روڈ، حویلیاں ضلع ہزارہ
۳۹- شیخ سعید احمد خاکسار مارکیٹ فاروق جنرل سٹورز ڈیرہ غازی خاں
۴۰- محمد اشرف، مسلم نیوز ایجنسی چکوال ضلع جہلم
۴۱- خواجہ محمد یونس نیوز ایجنٹ کندھکوٹ ضلع جیکب آباد
۴۲- عبدالعزیز دوکان نمبر ۵- ۲۱، ایریا مارکیٹ پی او ایف واہ کینٹ
۴۳- عبدالواحد جامع اہلحدیث امین پور بازار، لائل پور